شعری مجموعہ

دُھوپ کا درخت



منظور ندیم

منظور ندیم کا کلام پہلی بار سُنا۔ ہندوستان اتنا عظیم مُلک ہے کہ اُس کے اُدباء وشعراء کا احاطہ کرنا مشکل امر ہے۔ بہت سے ایسے حضرات ہیں، بلکہ اُن کو جواہرات کہیئے، جو گمنامی میں رہ جاتے ہیں۔ شہرت تو درکنار اُن کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ لیکن مُضطرب صاحب نے خدا معلوم کتنا مطالعہ کیا ہے کہ ہر صوبے کے شاعر پر نگاہ ہے، اور اچھی نگاہ مَیں اس لئے کہوں گا کہ جو بھی کلام مُجھے انھوں نے سُنایا زیادہ تر مُجھے اس پر اتفاق ہی ہُوا۔ لیکن کچھ کلام ایسا بھی سُنایا، جسے سُن کر مَیں چونک گیا۔

اس فہرست میں منظور ندیم کا بھی کلام ہے۔ یہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ایسے شعر کہتے ہیں، تعجّب اور حیرت ہے۔ ضرور ایسی خلش جاگزیں کئے ہوئے ہیں جو کسی ماحول اور کسی زمانے میں بھی اپنی ترجمانی کرسکتی ہے۔

مقصد زندگی سے بے نیاز ہوکر جینا زندگی ہی میں ایک موت ہے۔ لیکن منظور ندیم نے اپنی زندگی کو عوامی زندگانی بنا کر زندگی کو محبوب بنایا ہے۔ انھوں نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن سے زمانے کے تغیّر پذیر فلسفے کی پوری تشریح ہوتی ہے۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں براہِ راست کہتے ہیں۔ چاہے تلخیاں زندگی کیلئے زہر ثابت ہوں، مگر گریز نہیں کرتے۔ یہی عزم اُن کی بیداری کا ثبوت ہے۔

رگھوپتی سہائے فراؔق گورکھپوری

(ماخوذ از فراؔق گورکھپوری، یادوں کے جھروکوں سے)

(حصّہ اوّل)

مرتّب حضرت مُضطرب نظامی، لکھنو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُن تمام مُخلصین کی نذر بطور ہدیۂ خلوص
جو دُور ہوتے ہوئے بھی نزدیک محسوس ہوتے ہیں۔

وہ تو کہیں ہیں اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شئے نگہِ یار کی طرح ۔
(مجروح سلطانپوری)

منجانب
منظور ندیم
31/10/2019

یہ کتاب مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو ساہیتہ اکادمی کی مالی اعانت سے شائع کی گئی ہے۔

ناشر	ڈاکٹر زُبیر ندیم 'گلُبرگ' آزاد کالونی' اکولہ' مہاراشٹر
سنِ اشاعت	۲۰۱۴ء
تعدادِ اشاعت	پانچ سو (۵۰۰)
صفحات	۲۳۲
قیمت	دو سو روپے
سرورق	شکیل اعجاز، اکولہ
کمپوزنگ	ضمیر ساجد
طباعت	ساجد اُردو پریس، اکولہ

● ملنے کے پتے

● ڈاکٹر زُبیر ندیم' راحت کلینک' یوسف علی کھدان' اکولہ رابطہ 09022866172
● ذاکر حسین' گرین مرچنٹ' انجمن بازار، بالاپور ضلع اکولہ رابطہ 09850520137
● جاوید عزیزی' نیوز پیپر ایجنٹ' پھلاری گلی مومن پورہ اکولہ رابطہ 09822373830
● غلام مصطفیٰ ناز، A/400 بلاک جے نارتھ ناظم آباد کراچی پاکستان
رابطہ 00922136702264

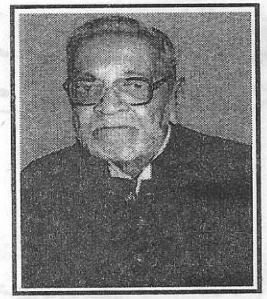
شعری مجموعہ

دُھوپ کا درخت

نہ خانقاہوں کے سائے نہ تاج وتخت مجھے
عطا ہُوا ہے بس اِک ''دھوپ کا درخت'' مجھے

منظور ندیم

یہ کتاب
مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو ساہیتہ اکادیمی
کی مالی اعانت سے
شائع کی گئی ہے۔



انتساب

والدِ محترم

الحاج غلام حسین صاحب راز بالاپوری

کے نام

جن کی بے مثال شفقت کی چھاؤں میں

میری نشوونما ہوئی۔

منظور ندیم

ترتیبِ مضامین

خصوصی تاثرات

اپنا بیان‘ .... حُسنِ طبیعت نہیں مُجھے۔

منظور ندیمؔ

زیرِ نظر کتاب ”دھوپ کا درخت“ میرا پہلا شعری مجموعہ ہے‘ جو میری تقریباً چالیس سالہ ادبی کاوشوں پر مشتمل ہے۔ میں نے اپنی عمر کے تیس سال عدلیہ میں بطور جج گزارے ہیں۔ اس دوران کئی بار طبیعت چاہی اور ادب دوستوں کا اصرار بھی رہا کہ میرا فکری اثاثہ کتابی شکل میں شائع ہو جائے۔ لیکن اوّل تو یہ کہ دورانِ ملازمت اتنا وقت نہیں مل پایا اور کچھ حسّاس محکمے کی عائد کردہ پابندیوں نے بھی باندھے رکھّا۔ خدا خدا کر کے چند ماہ قبل ملازمت سے سبکدوش ہو کر وظیفہ یاب ہُوا ہُوں۔ ان کچھ مہینوں میں سالہا سال سے التوا میں پڑے ہوئے جو چند اہم کام مَیں کر پایا ہُوں اُن میں سے ایک اپنے فکری سرمائے کے اوراقِ پریشاں کو یکجا کر کے اُسے کتابی شکل دینا بھی ہے۔

اپنی شاعری کے تعلّق سے مُجھے کچھ بھی کہنا نہیں ہے‘ بلکہ قارئین سے کچھ جاننا ہی مقصود ہے۔ البتہ اس موقع پر اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہُوں کہ میری فکرِ سخن کا پودا صبح و شام انگریزی اور مراٹھی زبان میں تیّار کردہ فائلوں اور قانون کی کتابوں سے نبرد آزما رہتے ہوئے پروان چڑھا ہے۔ اسی مناسبت سے مَیں نے اس شعری مجموعے کو ”دھوپ کا درخت“ عنوان دیا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں بطور معلّم برسرِ روزگار رہنے والے اکثر شعراء کو جو سازگار ادبی ماحول فرصتیں اور اردو لائبریریاں مہیّا ہوتی ہیں اور جو عام طور پر اُن کیلئے شہرتوں کے بامِ عروج پر پہنچنے کا ذریعہ بلکہ زینہ بن جایا کرتی ہیں‘ مجھے ملازمتِ عدلیہ میں کبھی دستیاب نہیں ہو پائیں۔ اسی لئے بھائی راحتؔ اندوری کے درج ذیل شعر کا اطلاق میری دانست میں اُن سے زیادہ مُجھ گوشہ نشینِ ادب پر ہوتا ہے۔

مَیں پربتوں سے لڑتا رہا‘ اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہو گئے

محترم ظفرؔ گورکھپوری نے بھی اس کتاب میں شامل اپنے مضمون ”منظور ندیمؔ کی غزل“ میں اس جانب واضح طور پر اشارہ کیا ہے۔

بہر حال......... مَیں نے ۲۵ / مارچ ۱۹۵۳ء کو بالا پور (ضلع اکولہ‘ مہاراشٹر) کے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی‘ جو معاشی اعتبار سے متوسّط‘ لیکن علمی و ادبی اعتبار سے خوش حال سمجھا جاتا ہے۔ میرے دادا حضرت غلام یٰسین صاحب خورشیدؔ مرحوم بالا پور کے مستند شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ والدِ محترم حضرت غلام حسین صاحب رازؔ بالا پوری عرصۂ دراز سے علاقۂ ودربھ کے بزرگ شعراء کی صف میں نمایاں مقام بنائے ہوئے ہیں۔ اُن کے پانچ شعری مجموعے اور سفرناموں کا ایک مجموعہ شائع ہو کر اِنڈو پاک میں اہالیانِ فکر و نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ محترم چچا جان غلام مصطفٰی نازؔ صاحب (جو تقسیم مُلک کے وقت سے کراچی‘ پاکستان میں سکونت پذیر ہیں) عمدہ فکرِ سُخن کے مالک ہیں۔ میرے ایک عم زاد غلام ربّانی صاحب نعیمؔ مرحوم بھی اچھّے شاعر تھے‘ جن کا شعری مجموعہ ”مُشکِ خُتن“ کے نام سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ میرا ایک بھتیجا ”ابرار کاشفؔ“ (جس نے اِن دنوں مشاعروں کی دُنیا میں دھوم مچا رکھّی ہے) بھی اِسی خانوادۂ بالا پور کا رُکن نیز یہیں کی مٹّی میں اُگا نونہالِ ادب ہے۔

۱۹۶۶ء میں آٹھویں جماعت کے بعد آگے کی تعلیم کیلئے جب مَیں بالا پور سے اکولہ آیا‘ اُس وقت بھائی ربّانی نعیمؔ پہلے ہی سے اکولہ میں زیرِ تعلیم تھے اور اپنی شعر گوئی کا آغاز کر چکے تھے۔ چنانچہ اُن کے ساتھ مَیں بھی اکولہ کی شعری و ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگا۔ ایک معتبر شاعر کا خون تو پہلے ہی سے میری رگوں میں گردش کر رہا تھا‘ چنانچہ مَیں ۱۹۶۸ء میں منظور حسین سے ”منظور حسین ندیمؔ بالا پوری“ اور پھر رفتہ رفتہ ”منظور

ندیم'' ہوگیا۔ اس دوران ۱۹۷۴ء میں بی۔اے۔ ۱۹۷۷ء میں ایل ایل۔بی اور ۱۹۷۹ء میں ایم۔اے (اردو ادب) کی ڈگریاں ناگپور یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ پرائیوٹ وکالت کے زمانے میں کچھ سماجی' سیاسی و ادبی انجمنوں سے وابستگی بھی رہی۔ ۱۹۸۱ء میں منگرول پیر کی عدالت میں بطور سرکاری وکیل میرا تقرر عمل میں آیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۱۹۸۴ء میں بطور سول جج میرا انتخاب ہُوا تو مَیں اہم ذمّہ داریوں اور مختلف پابندیوں سے بھری اس ملازمت کو گلے لگانے کیلئے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیّار نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن والدِ محترم کے ایک جملے نے اس طائرِ آوارہ مزاج کے پَر باندھ دیئے اور اُسے عدلیہ سے جوڑ دیا۔ موصوف نے فرمایا تھا کہ ''میاں مَیں ایک وکیل کا نہیں جج کا باپ کہلانا پسند کروں گا۔''

عدلیہ سے وابستگی کے باعث اگرچہ کہ مشاعروں میں شریک ہونا بہت کم ہوگیا' لیکن عدلیہ میری فکر کے پَروں کو باندھ نہیں پائی۔ مَیں لاکھ مصروفیات کے باوجود کسی طرح شعر کہتا رہا اور مُلک و بیرونِ مُلک کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوتا رہا۔ یہاں یہ بھی واضح کردوں کہ اب تک جو کچھ مَیں نے کہا ہے اپنے وجدان اور دلِ بیدار کے سہارے' کسی سے شرفِ تلمّذ حاصل کئے بغیر کہا ہے۔ میری اکثر غزلیں خود میرے والدِ محترم نے مجھ سے براہِ راست مشاعروں میں یا ریڈیو وغیرہ پر سُنی ہیں۔ یا پھر رسائل و اخبارات میں پڑھی ہیں۔ البتہ اس حقیقت سے نہ تو انکار کرسکتا ہوں' نہ کرنا چاہتا ہوں کہ اُن کے مفید مشوروں کی روشنی میں اپنے اشعار کی نوک پلک مَیں نے اکثر درست کی ہے۔ میرے تینوں بھائی' بیٹی' بیٹا اور خصوصاً میری اکلوتی چھوٹی بہن کے علاوہ بیگم منظور ندیم بھی ماشاء اللہ اچھا ذوقِ سخن رکھتی ہیں۔ ملازمت کیلئے ترکِ وطن سے قبل اپنے علاقے میں ڈاکٹر محبوب راہیؔ، مصطفیٰ جمیلؔ، خلشؔ تسکینی، ضیاء زخمیؔ اور ربّانی نعیمؔ صاحبان کی صحبتوں سے بھی مَیں نے استفادہ کیا ہے۔

یہاں اکولہ ضلع کے دیگر اہم شعراء غنی اعجازؔ مرحوم، انوار نشترؔ، فصیح اللہ نقیبؔ، اقبال خلشؔ، قاضی رؤف انجمؔ، ضمیر ساجدؔ وغیرہ نیز نئی نسل کے شعراء کا ذکر مَیں نے اس لئے نہیں کیا ہے کہ اُن کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے کے مواقع مجھے کم ہی نصیب ہو پائے ہیں۔ میرا یہی معاملہ خود میرے اپنے شہر کے دیگر شعراء نیاز علی نیازؔ، ظہیر احمد ظہیرؔ، احمد امامؔ، اور عارف زماںؔ وغیرہ کے ساتھ بھی رہا۔

بڑی ناانصافی ہوگی اگر مَیں اس موقع پر اپنے دو کرم فرماؤں نیز بزرگ نما دوستوں انجمؔ رومانی مرحوم اور شمس اعجازؔ مرحوم کو یاد نہ کروں۔ اگرچہ کہ انجمؔ صاحب بمبئی میں ''اردو ٹائمز'' سے اور شمسؔ اعجاز صاحب بھساول میں پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ رہے' لیکن مَیں اپنی ملازمت کے دوران جہاں جہاں بھی ٹرانسفر ہُوا' میری محبّت اِن دونوں کو وہاں وہاں مجھ سے ملنے کیلئے برابر کھینچ لائی ان کی حوصلہ افزائی اور بے تکلفّی نے بھی میرے ذوقِ شعر گوئی کو جِلا بخشی ہے۔

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مَیں نے عمرِ عزیز کے کئی سال کلاس ون آفیسر کی حیثیت سے ضرور گزارے ہیں' لیکن ذاتی زندگی میں زخم بھی بہت جھیلے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو تو مَیں مات دے چکا ہوں لیکن فروری ۱۹۶۶ء میں (جبکہ مَیں محض تیرہ سال کا تھا) والدہ صاحبہ کی رحلت نیز اگست ۲۰۱۱ء میں جواں سال چھوٹی بیٹی کی رحلت' دل اور گُردے پر لگنے والے وہ کاری زخم ہیں جن سے آج تک خون رِس رہا ہے۔ زیادہ تفصیل میں جانا میرے لئے آسان نہیں۔ گُردے کی بیماری میں مبتلا بیٹی کی اچانک موت پر جو جذباتی نظم ''رُخصتی'' مَیں نے لکھّی ہے اُسے اِس کتاب میں شامل تک کرنے کی ہمّت مَیں جُٹا نہیں پا رہا ہوں۔ میرے چھوٹے بھائی ''ظفر'' کے تعلق سے اس شعری مجموعے میں دو تین تخلیقات نظر آئیں گی۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب زخم ہے' جسے فی الحال تو مَیں کوئی نام بھی دے نہیں سکتا۔ بہر حال............ ۔

زخم جھیلے ہیں بہت' خاک بہت چھانی ہے .
زندگی تجھ سے مگر ہار کہاں مانی ہے ؟

کتاب کے نثری حصّے کے تعلّق سے کچھ باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ مُجھ ننگِ ادب پر شہرۂ آفاق شاعر آنجہانی رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری کے جو تاثرات اس میں شامل ہیں' وہ حضرت مُطربؔ نظامی (لکھنؤ) کی شائع کردہ ضخیم کتاب ''فراقؔ گورکھپوری' یادوں کے جھروکوں سے (حصّہ اوّل) سے ماخوذ ہیں۔ یہ ۱۹۸۱ء کی بات ہے۔ اُن دِنوں مَیں منگرول پیر میں گورنمنٹ پلیڈر تھا اور رسائل میں بہت شائع ہُوا کرتا تھا۔ اس کتاب میں انڈو پاک کے کئی شعراء پر فراقؔ صاحب کے تاثرات شامل ہیں۔ کتاب کے دونوں حصّے (حصّہ اوّل اور حصّہ دوّم) اہالیانِ شعر وادب کی ضیافتِ طبع کیلئے میری ہوم لائبریری میں دستیاب ہیں۔ حضرت رئیسؔ امروہوی مرحوم (کراچی) کا مضمون ''منظور ندیمؔ بیک نظر'' بھی کافی پُرانا ہے جو ۱۹۹۴ء میں ماہنامہ ''فاران'' کراچی اور روزنامہ ''اردو ٹائمز'' بمبئی میں شائع ہو چکا ہے۔ کاش ان دونوں بزرگانِ سُخن کی حیات میں اِس کتاب کا اجراء ہو پاتا۔ محترم ظفرؔ گورکھپوری صاحب' ڈاکٹر ملک زادہ منظورؔ احمد صاحب (لکھنؤ) اور سیّدہ نسرین نقّاش صاحبہ (سری نگر کشمیر) کے مضامین بھی گذشتہ دہائی کے الگ الگ وقتوں میں تحریر کردہ ہیں۔ مَیں پہلے ہی عرض کر چکا ہُوں کہ دورانِ ملازمت مَیں نے کئی بار چاہا کہ میرا شعری مجموعہ شائع ہو جائے اور اس غرض سے یہ مضامین بھی قلمبند کئے گئے تھے' جو میری ادبی فائل کا حصّہ بنے رہے۔ مَیں کتاب کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر کیلئے اِن تینوں سے معذرت خواہ ہوں۔ البتّہ والدِ محترم حضرت رازؔ بالاپوری اور ڈاکٹر قاسم امامؔ صاحب (بمبئی) کے مضامین حال ہی میں لکھے گئے ہیں۔ والدِ محترم کا اس پیرانہ سالی میں میرے تئیں ''پس و پیشِ قلم'' میرے لئے تبرّک کا درجہ رکھتا ہے' جسے اپنا حق جان کر مَیں نے اس کتاب میں شامل کرنے کی

سعادت حاصل کی ہے۔ مذکورہ بالا تمام ماہرینِ فکر وفن کا ندیمؔ نوازی کیلئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ یہ اُن کی وسیع القلبی اور خلوص ہے جو انھوں نے مجھے کسی قابل جانا۔ ورنہ ''ہمن آنم کہ من دانم''

ساتھ ہی اس مجموعے کی اشاعت کیلئے مالی اعانت کی فراہمی پر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادیمی کا بھی مشکور ہوں۔ محترم فصیح اللہ صاحب نقیبؔ، جناب ایم۔ رفیق صاحب (بیاول جلگاؤں) اور برادرم ضمیر ساجدؔ صاحب (اکولہ) کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس مجموعے کی اشاعت میں گاہے گاہے مُجھ سے تعاون فرمایا۔ کتاب کے سرِ ورق کیلئے علاقۂ برار کے مایۂ ناز آرٹسٹ شکیل اعجاز کا شکریہ اس لئے ادا نہیں کر رہا ہوں کہ وہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز ہیں۔

آخر میں یہ بات واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مَیں اپنی شاعری کے تعلّق سے کسی خوش فہمی کا شکار ہرگز نہیں ہوں۔ ویسے بھی فکرِ سُخن کی صحیح آبیاری کیلئے جس سازگار ادبی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھے عدلیہ کے تیس سالہ سفر میں کبھی دستیاب نہیں ہو سکا۔ اربابِ فکر ونظر میری ادبی کاوشوں کو یکجا دیکھ لیں اور مطالعہ کر کے مجھے اپنی قیمتی آراء سے نوازیں' یہی اس شعری مجموعے کی اشاعت کا مقصد ہے ورنہ بفضلِ تعالیٰ و بقولِ غالبؔ ؎

کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

منظور ندیمؔ
۵ مئی ۲۰۱۴ء

'' گلبرگ'' آزاد کالونی، اکولہ، 444004 مہاراشٹر، انڈیا
رابطہ (موبائل فون) 09372501237 (فون رہائش گاہ) 0724-2458989

منظور ندیم "بیک نظر"

از : رئیس امرہوی، کراچی (پاکستان)

منظور ندیم بالا پوری کو اُن گہری' دُوررَس اور ہمہ گیر تبدیلیوں کا مکمّل احساس ہے جن سے فرد اپنی خارجی اور داخلی زندگی میں دوچار ہے۔ یہ احساس جب شعر وادب کا روپ اختیار کرلیتا ہے تو اُس کی تاثیر اور تاثر میں ہزار گُنا اضافہ ہوجاتا ہے۔ منظور ندیم کی شاعری جدید عہد کے نفسیاتی کرب اور روحانی کشمکش کی ترجمانی ایک ایسی معنویت اور جامعیت سے کرتی ہے کہ اُن کے کلام کا مطالعہ کرنے والا عجب قسم کی لذّت محسوس کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

آؤ کچھ اور سُنو مجھ سے زمانے والو
شعر و نغمے کا بدلتا ہُوا رُجحان ہُوں مَیں

شعر و نغمے کا یہ بدلتا ہُوا رُجحان کیا ہے؟ اس رجحان کو دریافت کرنے کیلئے ہمیں اس عہد کی سماجی زندگی کے ہر پہلو کی طرف اشارہ کرنا پڑے گا۔ ہم ایک ایسے عہد سے گزر رہے ہیں' جب معروف و متعارف اقدار و نظریات کے تمام پُرنور مینار منہدم ہوچکے ہیں اور مشینی تہذیب کی مسحور کُن جگمگاہٹ کے باوجود روحوں کے حُجرے اور دِلوں کے تمام روشندان گھُپ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہم ایک ایسی دیوزاد مشین کے پُرزے ہیں جس کی حرکت' سکون' رفتار اور سمت پر ہمارا کوئی بس نہیں چلتا۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے جہاں انسانیت کیلئے انگنت آسانیاں بہم پہنچائی ہیں اور مُشتِ خاکی کو ہمدوشِ ثُریا کردیا ہے وہاں انسان کو عہدِ حاضر کے معاشی' سیاسی اور سماجی نظام کا ایک ضمنی

آلۂ کار بنا کر اُس کی حیثیت کو گھٹا دیا ہے۔ انسانی روح اُن نادیدہ زنجیروں کے خلاف احتجاج پر مجبور ہے' جس نے ہماری فکری اور نظریاتی آزادیوں اور حُریتِ جُہد و عمل کو سلب کرلیا ہے۔

بہتر ہے کہ ہم منظور ندیم کی شاعری کا مطالعہ اُسی نقطۂ نظر سے کریں۔ منظور ندیم نے کائنات کی خارجی حقیقتوں کا مطالعہ اپنی ذاتی زندگی کی محرومیوں کے حوالے سے کیا ہے۔ اُن کی غزلیات میں انسان کی عام طور پر بسر کی جانے والی زندگی کے دُکھ سُکھ شاعرانہ اندازِ بیاں کے ساتھ عیاں اور نمایاں ہوئے ہیں۔

درد کے کھیت میں مُسکان اُگانے والا
کتنا خوش ظرف ہے زخموں کو چھپانے والا
یاد آتا رہا تا دیر سفر میں مُجھ کو
ہاتھ رہ رہ کے دریچے سے ہلانے والا

یہ وہ عام مگر ناگزیر مشاہدات اور اجتماعی تجربات ہیں جن کا ادراک تو ہر شخص کرتا ہے مگر جن کا بھرپور اظہار شعری زبان ہی میں ممکن ہے۔ منظور ندیم کو زندگی کی تلخی کا پوری شدّت سے احساس ہے۔ تلخی اور تلخ کامی کا یہ شعور اُن کی غزل کی بنیادی خصوصیت ہے اور یہی وہ چیز ہے جو شعر میں ایک ایسی کیفیت پیدا کردیتی ہے جسے ماورائے شعر کہا جاتا ہے۔

(ماورائے سخن بھی ہے اک بات) کہتے ہیں۔

آلودۂ مسائل دُنیا یہ جھیل ہے
میری غزل میں کب ترا عکسِ جمیل ہے؟
ہمدردیوں کی بھیک نہیں مانگتا ندیم
اس ضمن میں یہ شخص بڑا خود کفیل ہے

مصرع نمبر ۴ میں ''خودکفیل'' کا لفظ بہت پُرمعنیٰ ہے۔ندیم کا تخلیقی سفر اپنی ذات کے اندر اور ذات کے باہر..........دونوں سمتوں میں بیک وقت جاری ہے۔اپنی تہذیب کی آئینہ گری بھی وہ اس طرح کرتے ہیں کہ۔

اپنی تہذیب کو ہر رنگ میں دیکھا جائے
شیش محلوں میں کبھی شب گئے جھانکا جائے

''شیش محل'' تہذیبِ جدید کا استعارہ ہے۔بقول اقبال۔

تہذیب نوی کار گہہِ شیشہ گراں ہے

تہذیبِ جدید کا اندرونی چہرہ دیکھنے کیلئے اُس کے اندر جھانکنا چاہیئے اور وہ بھی شب گئے' یعنی آخرِ شب میں۔آخرِ شب سے ہمارا تصوّر ہمیں اُن عشرت خانوں کی طرف لیجاتا ہے جہاں سرِ شام بے معنی مصنوعی زندگی کی دھوم دھام پورے زور وشور سے شروع ہوتی ہے اور جُوں جُوں رات گزرتی چلی جاتی ہے' کیف وسرور اور ناؤنوش کے ہنگامے مدھم پڑتے چلے جاتے ہیں اور انجامِ کار۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

منظور ندیم نے ذات سے باہر کی زندگی کا مطالعہ اپنے احساس وادراک کی عینک سے کیا ہے۔پھر وہ اپنی ذات کے اندر کے ایک معاملے کی طرف یُوں رجوع ہوتے ہیں۔

ہائے رے ضبطِ محبّت میں یہ ثابت قدمی
مجھ سے کاغذ پہ بھی وہ نام نہ لکھا جائے

معاملے کے لفظ نے ذہن کو قدیم غزل کی ایک یادگار خصوصیت کی جانب منتقل کر دیا' جسے ہمارے اساتذۂ سخن ''معاملہ بندی'' کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔معاملہ بندی' راز و نیاز' عمل وردِ عمل اور خلوت وجلوت کے وہ تجربے' وہ مشاہدے اور وہ معاملے ہیں' جو اہلِ

دل کو اس کوچے میں پیش آتے ہیں۔لکھنؤ کے دبستانِ غزل میں معاملہ بندی کے مضامین کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ان معاملات کا تعلّق خارجی تجربات سے ہے۔یعنی محبوب کی چہرہ نگاری' سراپا نویسی' وصل کے چونچلے' حیا کے کرشمے' رقیبانِ سنگ دل کی سازشیں اور عاشقِ جگر سوختہ پر محبوب کی نوازشیں وغیرہ وغیرہ۔ان معاملات میں بھی ایک لُطف ہے۔عام طور پر دہلی ''مکتبۂ فکر'' کے متعلّقین (غزل سرا حضرات) کا پیمانۂ احساس اور سرمایۂ ادراک کچھ اور ہے۔منظور ندیم کی غزلیات میں بھی زندگی (اُس کا ایک پہلو محبّت اور محبوب بھی ہے) کے مسائل ومعاملات کو شعر کے لہجے میں ادا کیا گیا ہے' مگر اُن کے احساسات پر عصرِ حاضر کی چھاپ غالب ہے۔مثلاً۔

ان دفینوں ہی میں گُم ہیں کہیں انجُم کے خطوط
پھر سے کالج کی کتابوں کو ٹٹولا جائے

کالج کی کتابوں میں انجم کے خطوط کو ٹٹولنا اس عہد کا تجربہ یعنی عشقِ جدید کا معاملہ ہے۔روایتی شاعری کے زمانے میں نہ کالج تھے نہ کتابیں اور نہ کالج کی بیچاری طالبہ ''انجم'' اس عہد کی سماجی زندگی کے مظاہر اور مسائل کچھ اور تھے اور ہم بیسویں صدی کے آخری عشرے میں حُسن وعشق کی اُن مشینی وادیوں سے گزر رہے ہیں' جہاں حُسن اپنی پچھلی معصومیت اور عشق اپنی سابقہ عظمت کھو چکا ہے۔اب محبّت کے معاملات اور جدید غزل سراؤں کے تجربات کچھ اور ہیں۔

مشینی دَور میں اتنی سہولتیں کب ہیں؟
نہ اب وہ روٹھ کے بیٹھے نہ مَیں مناؤں اُسے

مَیں وہ خطوط بھی تیرے جَلا نہیں پایا
گرے تھے شیشۂ دل پر جو پتھروں کی طرح

عجیب کرب تھا اس سال بارشوں میں ندیمؔ
کسی کی یاد ٹپکتی رہی چھتوں کی طرح

جام جذبات کا چھلکے تو تجھے خط لکھوں
شب کا آنچل ذرا ڈھلکے تو تجھے خط لکھوں
بیقراری مرے مکتوبِ جوابی کیلئے
تیرے مکتوب سے جھلکے تو تجھے خط لکھوں

بزمِ یاراں ' چائے خانے ' قہقہے ' آوارگی
نعمتوں سے ہاتھ اُٹھانا ' کیا یہی ہے زندگی
سب کے اُجڑے گھر بسانا اپنے احکامات سے
اپنے گھر ہفتوں نہ جانا کیا یہی ہے زندگی

فرصت کے چند لمحے بھی اب جیب میں نہیں
دل مانگتا ہے دن کوئی اتوار سا ہنوز

اتوار سا کوئی دن (تعطیل اور یومِ فرصت) مانگنا جدید دَور کی معاملہ بندی ہے۔

ہاتھ میں آکر کبوتر جیسے چھوٹ جائے
یُوں تری یادوں کے عالم میں گزر جاتی ہے رات

کہیں کہیں اُن کا ذہن روز مرّہ بسر کی جانے والی زندگی کی تلخیوں سے بلند تر ہو کر خالص غزل کی فضا میں پرواز کرنے لگتا ہے۔

کھلکھلا اُٹھتے ہیں احساس کے سوکھے ہوئے پھول
یُوں ٹپکتی ہے تری یاد کی شبنم جاناں

تیرے پیروں میں کہاں دشتِ وفا کے کانٹے
تُو کہ اس راہ سے گزرے ہے بہت کم جاناں

منظور ندیمؔ بطور سِول جج ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے خاندان سے منسلک بھی ہیں جو ادب سے وابستہ اور تہذیبی مزاج کا حامل رہا ہے۔اُن کے والدِ بزرگوار حضرت رازؔ بالاپوری ''صاحبِ متاعِ احساس'' ہیں۔اہلِ ذوق کے حلقوں میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ندیمؔ اپنی خاندانی روایت کے علم بردار ہیں۔زبان کے حُسن شناس اور حُسن و عشق کے مزاج داں ہیں۔یقیناً اُن کا مجموعۂ کلام ''دھوپ کا درخت'' اُن کی ادبی حیثیت کے اعتراف اور تعیّن میں مفید ثابت ہوگا اور ابھی تو اس نوجوان شاعر نے تخلیق کی پہلی منزل طے کی ہے۔ابھی نہ جانے تکمیلِ فن کی کتنی منزلیں اس کیلئے چشم براہ ہیں۔

یک بیاباں بگذشیم و دگر در پیش است

★★★★★

منظور ندیم کی غزل

از : ظفر گورکھپوری

تعلیم وتدریس کے شعبے سے وابستہ شاعر یا ادیب اپنے فن کے ساتھ نباہ کرسکتا ہے کیونکہ یہ شعبہ ادبی سرگرمیوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتا بلکہ کسی ایک خاص مرکز پر آ کر دونوں (تعلیم وتدریس اور ادب) ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہوجاتے ہیں۔اس برخلاف قانون جیسے شعبے میں رہنا' عدالت میں منصف کی کرسی پر بیٹھ کر یہ دیکھنا کہ کوئی گنہگار بے سزا نہ رہے اور کوئی بے گناہ سزا نہ پاجائے اور اس Process میں مختلف زبانیں بولنے والوں سے دوچار ہونا فریادوں گواہیوں اور دلائل کے لامتناہی سلسلوں کے درمیان ذہن کی زرخیزی اور تخلیقی عمل کو زندہ رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ مجھے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ وسیشن جج جناب منظور ندیم کو تہنیت پیش کرنا چاہیئے کہ وہ گذشتہ ۱۸ رسالوں سے ایک ہاتھ میں ادب اور دوسرے ہاتھ میں قانون لیکر چل رہے ہیں۔روزمرہ کے قانونی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ اتنے انہماک سے تخلیقی کام کرنا' ملک اور بیرونِ ملک کے معیاری ادبی رسائل واخبارات میں کلام شائع کروانا' ریڈیو اسٹیشنوں اور مشاعروں جیسے ذرائع ابلاغ کے ذریعے بے شمار اردو قارئین تک کلام کی ترسیل بلاشبہ ایک قابلِ ستائش عمل ہے۔ مجھے منظور ندیم کی اس جرأتِ رندانہ نے ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا کردیا ہے۔

ہندوستان میں کسی قانون داں کا شاعر ہونا کوئی پہلا واقعہ نہیں۔ماضی میں اکبرؔ الہ آبادی' اور ہمارے عہد میں پنڈت آنند نرائن مُلّا اور سکندر علی وجدؔ بھی جج ہونے کے

ساتھ اعلیٰ پائے کے شاعر ہوئے ہیں۔میرا خیال ہے اگر قدرت نے شعرگوئی کی صلاحیتیں ودیعت کی ہوں' ادب سے فطری لگاؤ ہو' اردو کا تہذیبی ماحول میسّر ہو اور اس کے ساتھ ایک تخلیقی اضطراب اظہار کا لباس پہننے کیلئے دلِ شاعر کو بے چین رکھتا ہو تو پیشہ (Profession) خواہ وہ طب کا ہو یا قانون کا یا اور کوئی پیشہ' اظہار کی راہ میں رُکاوٹ نہیں پیدا کرسکتا۔اسی لئے منظور ندیم کا تخلیقی سفر جاری ہے۔

منظور ندیم بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔

فی زمانہ جس نوع کی غزلیں کہی جارہی ہیں' جو آئے دن رسائل میں چھپتی ہیں اور مشاعروں میں سُنائی بھی جاتی ہیں اُس سے ایسا محسوس ہوتا ہے غزل گوئی ایک مشکل فن ہوتے ہوئے بھی نہایت آسان فن بن گئی ہے یا بنادی گئی ہے۔ایک جیسے موضوعات' ایک جیسا اسلوب' ایک جیسا آہنگ' گویا ایک ہی ٹکسال کے نکلے ہوئے سارے سکّے۔ ایک چیز اور جو باعثِ تشویش ہے وہ یہ کہ صحافتی انداز سے سیاست کو غزل میں داخل کرنے کا رویّہ عام ہورہا ہے۔غزل کا رمزیہ اور علامتی مزاج جس کا متحمل نہیں۔سیاسی مضامین ضرور غزل میں آئیں لیکن وہ تخلیق بن کر آئیں۔"رپورٹنگ'' بن کر نہیں۔اس عہد میں فیضؔ اور مجروحؔ کی غزلوں سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔

یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ منظور ندیم نے اپنی غزل کو اس قسم کی مضحکہ خیزیوں سے بچالیا ہے۔ان کی غزل اپنے عصر کی حِسّیات اور اپنے دَور کی معاشرتی ناہمواریوں کی عکّاس اور اس کا تخلیقی اظہار ہے۔جس میں عصرِ حاضر کا وہ کرب پوشیدہ ہے جس کے بغیر کوئی فن پارہ مکمل نہیں ہوگا۔منظور ندیم کے ہاں یہ کرب مختلف مرحلوں میں مختلف زاویوں سے سامنے آیا ہے۔ ؎

بیوی بچّوں کے مسائل نے مجھے جیت لیا
چاند یادوں کا تری ڈوب گیا دھیرے سے

مہلت کچھ اور چاہیئے مجھ کو خیالِ یار
ٹیبل پہ فائلوں کا ہے انبار سا ہنوز

وہ شخص شہر میں مجھے پہچانتا نہیں
مَیں جس کا حال پوچھنے آیا ہوں گاؤں میں

دل میں اخلاص، وفاؤں کی ہے گٹھری سر پر
آدمی ہے یہ کسی اور زمانے والا

کرب کس طرح جدید غزل میں ڈھلتا ہے اور شاعر کا تجربہ کس طرح عام انسان کا تجربہ بن جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

ترا پڑوس بھی پا کر نہ کھل سکی قسمت
پڑی ہے بند ترے گھر کی کھڑکیوں کی طرح

عجیب کرب تھا اس سال بارشوں میں ندیم
کسی کی یاد ٹپکتی رہی چھتوں کی طرح

منظور ندیم کو ذات کے حوالے سے کائنات تک پہنچنے کا پورا شعور ہے۔ یہ اُن کے تخلیقی عمل کی خوبی اور ان کی فنکارانہ چابکدستی ہے کہ معاشرتی مسائل کے اظہار میں تغزّل کا دامن اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

رات یُوں ہم پہ درِ فکر کھُلا دھیرے سے
کھول دے جیسے کوئی بندِ قبا دھیرے سے

ہُوا تھا ہم سے بھی ماضی میں سامنا اُس کا
ہمارے ساتھ بھی دو چار پل رہی ہے حیات

اُبھر سا آیا ہے ہر لفظ اُس کے چہرے پر
اگرچہ اُس نے مرا خط ابھی پڑھا بھی نہیں

اپنی اوقات سے کمبخت گزر جاتا ہے
میرا غم آپ کی پلکوں پہ ٹھہر جاتا ہے

مِلا ہُوں سب سے مگر خود سے مِل نہیں پایا
مرا وجود اکیلا مری تلاش میں ہے

زخم جھیلے ہیں بہت خاک بہت چھانی ہے
زندگی تجھ سے مگر ہار کہاں مانی ہے

شاعر غزل کا ہو یا نظم کا، آج بھی اُس کیلئے نئے موضوعات کی کمی نہیں۔ انسانی زندگی کل بھی بے شمار مسائل کے گھیرے میں تھی اور آج بھی اُسے بے شمار مسائل اور مصائب کا سامنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے مسائل کچھ زیادہ ہی سنگین ہیں۔ شرفِ انسانی کو ایسے خطرات کبھی درپیش نہیں تھے۔ جس معاشرے میں معصوم بچّوں، بے گناہ عورتوں اور کمزور بوڑھوں کو زندہ جلا دیا جائے وہ معاشرہ اپنے آپ کو مہذب نہیں کہہ سکتا۔ گجرات کے اردو شاعر احسان جعفری جن کو اُن کے مکان میں زندہ جلا دیا گیا، اُن کا قصور کیا تھا؟ منظور ندیم نے اپنے ایک شعر میں انسان کی بے رحمی اور سفّاکی کی وہ تصویر کھینچی ہے جس کے سامنے جنگل کی تہذیب بھی شرمندہ ہو جائے۔

ہمارا دل بھی ہے احسان جعفری کا مکاں
جَلا کے لوگ جسے مسکرا کے دیکھتے ہیں

روایتی غزل سے جدید غزل، جدید غزل سے مابعد جدید غزل تک ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد غزل آج اس مقام تک پہنچی ہے جہاں اُس کیلئے امکانات کے دروازے بند تو نہیں ہوئے ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ اچھے اور نئے شعر کی تخلیق کا عمل کم کم ہوتا جا رہا ہے، فی زمانہ غزل میں اپنا شعر کہنا یقیناً ایک بڑا چیلنج ہے اور منظور ندیم میں اپنا شعر کہنے کی ہمت بھی ہے اور صلاحیت بھی۔ بطور مثال اُن کا یہ مشہورِ زمانہ شعر۔

ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے

میں اُن کے شعری مجموعے ''دھوپ کا درخت'' کا استقبال کرتا ہوں اور اُمیّد رکھتا ہوں کہ مُلک و بیرونِ مُلک کے ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

اے ۳۰۲، فلوریڈا
شاستری نگر، اندھیری (ویسٹ)
بمبئی ۴۰۰۰۵۳

''پس و پیشِ قلم''

از : رازؔ بالاپوری

بندہ زادہ منظور حسین جسے دُنیائے شعر و ادب منظور ندیمؔ اور دنیائے عدل و قانون ایم۔ ایچ۔ ندیمؔ ڈسٹرکٹ جج و ایڈیشنل سیشن جج کے نام سے جانتی ہے، چند ماہ قبل اپنی عمر کے ساٹھ سال مکمّل کر کے باوقار وظیفہ یابی سے ہمکنار ہُوا ہے۔ اب سُن رہا ہوں کہ کسی فاسٹ ٹریک کورٹ میں بطور اکسٹرا سیشن جج پھر سے اُس کا تقرر ہونے والا ہے۔ یہ وہ سعادت مند بیٹا مگر چوکنا انسان ہے جس نے اپنے باپ کی نصف درجن کتابیں چھپوا کر اُسے ہند و پاک کی ادبی فضا سے روشناس کرا دیا، لیکن چند دانشمندانہ مصلحتوں کے پیشِ نظر خود کے شعری مجموعے کی اشاعت سے گریز کرتا رہا۔ مشاعروں میں شرکت اور اُن کی صدارت سے بھی وہ اکثر انکار کرتا رہا ہے۔ خود اُسی نے کہا ہے۔

مجھ کو تسخیر نہ کر پائے کبھی نام و نمود
میرے دامن سے یہ لپٹے رہے خاروں کی طرح

مقامِ مسرّت ہے کہ اب وہ اپنا سرمایۂ فکر ''دھوپ کا درخت'' ساتھ لئے بساطِ شعر اپنی ہتھیلی پر سجانے کو آمادہ ہُوا ہے۔ ممکن ہے اس موقع پر گلستانِ ادب کے چند نامور خوشہ چینیوں نے بھی کچھ گُل افشانیاں کی ہوں۔ مگر میرے لئے تو عجیب پس و پیش کا معاملہ ہے۔

ایک باپ کا اپنے بیٹے کی شعر گوئی پر تبصرہ کرنا' پھر قلم کے اخلاص کا حق بھی ادا کرنا' گویا پھولوں کو لیکر کانٹوں بھری راہ سے بحفاظتِ تمام گزرنا' میرے لئے یقیناً ایک مشکل اَمر ہے۔اُس کی جدّت نواز کہنگی' اُس کی حرص و آز سے دوری' اُس کا ذوقِ نکتہ نواز' اُس کی فکر کے نشیب و فراز' اُس کے دور کے رسوم و رواج' اُس کے سر پر انصاف کے کانٹوں کا تاج۔کیسی کیسی پابندیوں اور کن کن اہم ذمہ داریوں سے نبرد آزما رہا ہے وہ۔اُس کے نادار باپ کے پاس اپنے ہونہار بیٹے کو دینے کیلئے اعلیٰ تعلیم' دولت و ثروت' اقتدار و شہرت کا کوئی سرمایہ کبھی نہ رہا۔وہ اُسے دے بھی کیا سکتا تھا۔اُس نے خود اپنے لئے میدان بنائے اور اُن پر مشق کرتے ہوئے اپنی محنتوں کوششوں اور صلاحیتوں کے نتائج اُبھارے۔

انڈین کلچرل سوسائٹی نئی دہلی برسوں قبل مومن خاں مومنؔ ادبی ایوارڈ اُس کی جھولی میں ڈال چکی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اُسے علم و فہم' عقل و فراست اور شعور و جذبات کے بھرپور ذخائر عطا فرمائے ہیں۔قارئین محسوس کر سکتے ہیں کہ مجھ جیسے کم پڑھے لکھے شخص کو یہ جان کر کتنی تقویت حاصل ہوئی ہوگی کہ اس کے بیٹے کی دو غزلیں ناگپور یونیورسٹی ایم۔اے۔فائنل (اردو ادب) کے نصاب میں شامل کر چکی ہے۔اُس کی شاعری پر مَیں کیا تبصرہ کروں۔اُس کا مجموعۂ کلام تو آپ کے ہاتھوں میں ہے ہی۔اُس کا محض ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ شعر جو زباں زدِ خاص و عام ہونے کی سند حاصل کر چکا ہے' میری دانست میں اُس کے تعارف' ادبی مقام کے تعیّن اور شناخت کیلئے کافی ہے۔

ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے

میری نیک خواہشات اُس کے شعری مجموعے کے ساتھ ہیں۔اب جب کہ وہ اپنی مصروف ترین ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہے فکرِ سخن کے نئے ابواب اُس پر کھُلنے کو

اب نظر آرہے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

احقر
غلام حسین رازؔ

یر آباد' بالاپور
لع اکولہ' مہاراشٹر

نئی غزل کا معتبر شاعر ''منظور ندیم''

سیّدہ نسرین نقّاش (سری نگر کشمیر)

صوبۂ مہاراشٹر فروغِ زبان و ادب کے تعلق سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ اور اُسے ہندوستان کے دیگر ادبی مراکز اور دبستانوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس سرزمین کی مردُم خیز مٹّی نے شعروادب کے ایسے ایسے لعل وجواہر جنمے ہیں جو آسمانِ ادب پر خورشید گہرتاب کی طرح درخشاں وتاباں ہیں۔

مہاراشٹر کے دارالخلافے اور عروس البلاد بمبئی کو یہ امتیاز و افتخار بھی حاصل رہا ہے کہ یہاں ہندوستان کے مختلف گوشوں سے ایسے ایسے آفتاب ومہتاب جمع ہوئے جنہوں نے اپنے دورانِ قیام عظیم ادبی شاہکاروں کی تخلیق کی اور دنیائے ادب میں نہ صرف مہاراشٹر بلکہ سارے ہندوستان کا نام روشن کیا۔ ماضی کے ان مشاہیر اکابرین میں خواجہ احمد عبّاس، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، جوشؔ ملیح آبادی، مجروحؔ سلطان پوری، ساحرؔ لدھیانوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمیؔ، جاں نثار اخترؔ، اور ساغرؔ نظامی وغیرہ کے اسمائے گرامی بطور ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں۔ آج بھی ظفر گورکھپوری، ندؔا فاضلی، ابراہیم اشکؔ اور عبدالاحد سازؔ جیسے شعراء اس سرزمین پر اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑے ہوئے ہیں۔ لندن کے معروف شاعر ساحرؔ شیوی کا وطنِ مالوف کوکن مہاراشٹر ہے۔ مغربی مہاراشٹر میں پونہ کو شہرت دلانے میں اندرا شبنمؔ اور نذیر فتحؔ پوری ایک اہم کردار نبھارہے ہیں۔ مراٹھواڑہ کی نمائندگی کا حق بشر نوازؔ ادا کررہے ہیں۔ علاقۂ ودربھ میں شعراء کی تعداد کثیر ہے۔ لیکن یہاں کے جو شعراء ملک و بیرون ملک کے معیاری و ادبی رسائل میں اکثر وبیشتر شائع ہوتے ہیں اُن میں محبوب راہیؔ اور منظور ندیمؔ سرِ فہرست ہیں۔ محبوب راہیؔ دکترِ ادب ہیں اور منظور ندیمؔ ماہرِ قانون۔ اوّل الذکر سے مَیں ذاتی طور پر واقف نہیں۔ لیکن ندیمؔ صاحب کو میں مشاعروں کے توسط سے بھی جانتی ہوں۔

اُن سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۹ء میں دہلی کے ایک انٹرنیشنل مشاعرے میں ئی تھی۔ جہاں انڈین کلچرل سوسائٹی کی جانب سے انھیں ادبی خدمات کے اعتراف میں ومن خان مومنؔ ایوارڈ عطا کیا گیا تھا۔ اُس وقت وہ نئے نئے جونیئر ڈویژن جج ہوئے تھے۔ لیکن ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے آج ضلع سیشن جج کے اعلیٰ منصب تک پہنچ ئے ہیں۔

یہاں یہ بات اہم اور قابلِ ذکر ہے کہ عدلیہ سے وابستگی خلافِ معمول ان کے بی وشعری سفر میں رُکاوٹ نہیں پیدا کرسکی۔ اس کی وجہ شاید ان کے خاندان کا ادبی ماحول ہے۔ ان کے والدِ محترم حضرت غلام حُسین رازؔ بالاپوری ودربھ کے کہنہ مشق اساتذۂ سُخن ں شمار کئے جاتے ہیں۔ جن کے تین شعری مجموعے 'متاعِ احساس' 'دامنِ شب' اور ''جامِ فال'' کے نام سے شائع ہوکر اپنے علاقے میں بھرپور پذیرائی حاصل کرچکے ہیں۔ گویا اعری منظور ندیمؔ کو ورثے میں ملی ہے۔ اس لئے اُنھیں کسی اور کے آگے زانوئے ادب تہہ رنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ شعری شغل کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم پر ی زور دیا اور ناگپور یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ پھر ازمت کی طرف دھیان دیا۔ چنانچہ پہلے گورنمنٹ پلیڈر ہوئے۔ پھر عدلیہ سے وابستہ وگئے۔

منظور ندیمؔ کو گھریلو ادبی ماحول میں شاعری کا چسکہ اوائلِ عمری میں ہی لگ گیا ا۔ اس لئے ملازمت کے ساتھ ہی وہ ادبی مطالعے اور مشقِ شعر وسخن پر بھی کسی طرح وقت رف کرتے رہے۔ اور جلد ہی اپنے ہم عصر شعراء میں مستند و معتبر تسلیم کئے جانے لگے۔ ان کا کلام ملک اور بیرون ملک کے مایہ ناز معیاری رسائل وجرائد نیز ادبی صحیفوں اور خبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوتا ہے۔ آل انڈیا مشاعروں اور ریڈیو اسٹیشنوں پر بھی ص کلام پیش کرنے کے مواقع آتے رہتے ہیں۔

منظور ندیمؔ نے یوں تو دیگر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن تمام

اصنافِ سُخن کی تاجدار ملکہ غزل ان کی محبوب ترین صنف ہے۔ جس سے انھیں والہانہ عشق ہے۔ انھوں نے اس بُتِ صد عشوہ طراز مہ لقا و مہ جبیں کی مشاطگی اور گیسو طرازی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انھیں کلاسیکی ادب اور روایت کا دَرک تو ہے لیکن گل و بلبل اور شمع پروانے کی حکایتی شاعری پر وہ جدید لب و لہجے کی شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ بھی معقول ہے۔ دراصل وہ اڑتالیس سالہ جوان العمر شاعر ہیں۔ آج سے ۲۵ رسال پہلے جب انھوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا' اس وقت جدیدیت پسپائی اختیار کر کے مابعد جدیدیت کی سلطنت میں پناہ گزین ہو چکی تھی۔ اور شاعری کو لایعنیت، قنوطیت، داخلی مجہولیت، تجریدیت، ابہامیت، مہملیت اور رجعت پسندی کے حبس زدہ ماحول اور تاریک غار سے کھلی فضاء نیز تازہ ہَوا اور روشنی میں لانے کا کام انجام دیا جا رہا تھا۔ لہٰذا فطری تقاضے کے عین مطابق منظور ندیم نے زبان تو وہی اپنائی جو جدّت کی زبان تھی لیکن دور اندیش اور صاحبِ نظر ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنی شاعری کو اوڑھی ہوئی بیمار ذہنیت، قنوطیت فرضی داخلی کرب اور ابہامیت و مہملیت سے دور ہی رکھا جیسا کہ اپنی شاعری کے حوالے سے ایک جگہ وہ خود بھی یوں رقم طراز ہیں۔

''مَیں صحت مند ادب برائے زندگی کا قائل ہوں۔ روایتی شاعری کا اسیر نہیں جدید خیالات سے استفادہ کرتا ہوں۔ لیکن جدید شاعری کی بے اعتدالیوں سے میں نے ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔''

انھیں کس طرح کی شاعری پسند ہے؟ ان کی اپنی شاعری کا جغرافیہ کیا ہے؟ وہ کس رنگ و آہنگ اور کس مزاج کے اشعار تخلیق کرتے ہیں؟ ان سبھی سوالوں کے جواب ان کی شاعری میں بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

یُوں تو روایتوں کے ہیں قائل سدا سے ہم
ہاں، فیض بھی اُٹھاتے ہیں تازہ ہَوا سے ہم

ندیم اس وادیٔ شعر و ادب میں ساتھ ہے سب کے
مگر انداز کچھ بھٹکا ہُوا محسوس ہوتا ہے

مجھے تلاشیئے کہ مَیں یہیں کہیں ہوں دستیاب
جدیدیت کی بھیڑ میں روایتوں کے درمیاں

متذکرہ ان کا تیسرا شعر اس حقیقت کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ان کی شاعری اس اعتبار سے تو سو فیصد جدید ہے کہ اظہارِ خیال کے لئے انھوں نے جدید لفظوں' نئے تلازموں تلمیحوں، اصطلاحوں، علامتوں نئے استعاروں کے ساتھ ہی پیکر تراشی کے فن کا بھی سہارا لیا ہے اس کے باوجود بھی اگر وہ خود کو روایتوں کے درمیان پاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی زبان صاف و شفاف سادہ سلیس شائستہ و شگفتہ اور رواں دواں ہے اور اصطلاحات و استعارات اور تلمیحات و علامات ان کی شاعری کے اجزاء ہوتے ہیں اور ان کے بیان و اسلوب میں ذرا بھی ژولیدگی اور پیچیدگی نہیں ہے۔ ان کے اشعار اپنی تشریحات اور تصریحات آپ ہوتے ہیں اور ان کے اشعار کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ روایتی شاعری میں جو سلاست و شعریت لفظی موزونیت رمزیت و اشاریت اور موسیقیت و حلاوت پائی جاتی ہے وہ ان کی جدید شاعری میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔

منظور ندیم کی طرح ان کی شاعری بھی جوان اور پُر شباب ہے جس میں ناز و غمزے عشوہ طرازیاں قاتل ادائیں، کمر میں بل اور حشر انگیز انگڑائیاں جوان دِلوں کو تڑپا کر رکھ دیتی ہیں۔ یوں تو ان کی شاعری میں سماجیات، اخلاقیات، سیاسیات اور حالاتِ حاضرہ کا عکس بھی اکثر جگہوں پر دکھائی دیتا ہے لیکن منظور ندیم کی غزل میں عموماً حبیب و محبوب کی قلبی واردات، باہمی معاملات، جذبات و احساسات بہت نفاست اور شائستگی سے نظم ہوتے ہیں۔ دنیا کی قابلِ احترام اقدار میں عشق ایک عظیم ترین قدر ہے۔ اور جذبۂ عشق کم و بیش ہر دل میں موجزن رہتا ہے۔ عشقیہ جذبات پاکیزہ خیالات اور روحِ جمالیات کے

پروردہ ہوتے ہیں جن کے بیان سے شاعری میں سوز و ساز پیدا ہوتا ہے۔اور غزل میں نغمگی و شیرینی اور شعریت و موسیقی کی فضاء ترتیب پاجانے پر اس میں بلا کا سرور و کیف پیدا ہوجاتا ہے۔جو وجد طاری کر دیتا ہے۔منظور ندیم کے اکثر اشعار موسمِ وصل و ہجر کی تڑپ اور یادوں کی سُہانی دنیائیں اپنے اندر سموئے ہیں۔یادیں ان کے عشقیہ سفر کا پڑاؤ ہیں۔وہ نکہتیں جو اوائل عمری میں ان کا دامن چھو کر گذر گئیں اور اُس دور کے جانفزا نغمے جو انھوں نے پھر کبھی نہیں سُنے وہ ان کی بازیافت اپنی شاعری میں یادوں کے وسیلے سے کرتے رہتے ہیں۔

ساحل کی بھیگی ریت پہ جلنے لگے ہیں پاؤں
ہے تیری یاد بھی کسی آزار کی طرح

کچھ وقت سفر میں کبھی گذرا تھا ترے ساتھ
اب تک مجھے شانے پہ ترا سر سا لگے ہے

کانوں میں آج تک تری سرگوشیاں سی ہیں
آنکھوں سے اب بھی جھیل کے منظر نہیں گئے

منظور ندیم کا مشاہدہ اور تجربہ قابلِ قدر ہے۔عورت کی نفسیات کا جو علم انھیں حاصل ہے وہ ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔آنکھوں کے اوراق پر لکھی تحریر کو پڑھ کر محبوب کے دل کا حال جان لینا ان کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔

اس کی آنکھیں کھُلے اوراق کی صورت ہیں ندیم
لاکھ وہ ہم سے ملے بند کتابوں کی طرح

جناب سیشن جج ہیں۔جب بہت سی فائلیں فیصلے کے لئے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں تو انھیں وحشت سی ہونے لگتی ہے اور افسوس ہوتا ہے تو اس بات پر ہوتا ہے کہ یہ فائلیں تو یادِ محبوب کے راستے میں بطور دیوار آ کھڑی ہوئی ہیں۔

مہلت کچھ اور چاہئے مجھ کو خیالِ یار
ٹیبل پہ فائلوں کا ہے انبار سا ہنوز

پھر حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے انھیں فائلوں کو وہ اپنے لئے راحتِ جاں بھی بنا لیتے ہیں۔ملاحظہ ہو۔

یہ کس کی یاد نے مقدموں میں بھر دیا ہے رنگ
یہ کون مسکرائے میری فائلوں کے درمیاں ؟

منظور ندیم کے چند اشعار پر ان کی ملازمت کے گہرے اثرات ہیں بھلے ہی یہ اشعار آفاقیت سے محروم ہوں، لیکن چونکہ ان کے دل کی آواز ہیں ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔''

رگ رگ سے جیسے پھوٹ رہی ہے حیاتِ نو
اور میرے آس پاس مزاروں کا سلسلہ

تم اپنی قید بال و پر سے کیوں دُکھی ہوا ے ندیم
تمھارا فن نکھر رہا ہے بندشوں کے درمیاں

تم تو خود ایک گنہ گارِ محبّت ہو ندیم
پھر دیا کرتے ہو اوروں کو سزائیں کیسے ؟

یوں تو نہیں کہ منظور ندیم سے قبل کسی جج پر شاعری کا نزول نہیں ہُوا۔ماضی میں اُردو کے مشاہیر شعراء آنند نارائن مُلّا، اکبر الہ آبادی اور خود مہاراشٹر میں سکندر علی وجد بھی جج رہ چکے ہیں۔لیکن فی زمانہ منظور ندیم کا یہ شعر حقیقت پر مبنی دکھائی دیتا ہے۔

شاعری کب کسی منصف کی ہے پہچان یہاں
اس ریاست میں کہاں کوئی مرا ثانی ہے ؟

عدلیہ اور شاعری سے بیک وقت اور مؤثّر وابستگی نے ان کی شخصیت کو یقیناً ایک منفرد مقام

عطا کر دیا ہے۔

ندیمؔ اک ماہرِ قانون ہو کر
زبانِ میرؔ کا فنکار بھی ہے

ان کا یہ مشہور شعر بھی ملاحظہ فرمائیں جو ضرب المثل بن کر عالمی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

ایک پتھّر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے

ساتھ ہی چند ایسے لازوال اشعار جن کی خوشبو سے ان کی شاعری ہمیشہ مہکتی رہے گی۔

چھو اس کو اے اسیرِ تمنّا ادب کے ساتھ
نازک بہت ہے ان کی عنایات کا بدن

بکھر رہی ہے مرے گھر میں روشنی اس کی
بُجھا رہا ہے کوئی بتّیاں نہ پوچھو ہو

ہم کرب کے حصار سے باہر نہیں گئے
تجھ سے بچھڑ کے زندہ رہے مر نہیں گئے

لوگ چہروں کو چھپائے ہوئے پھرتے ہیں ندیمؔ
شہر میں آیا ہے آئینہ دِکھانے والا

اس سُخن کی بزم میں ہم کیا جلاتے شمعِ فکر
چونچ میں سورج لئے جس بزم میں مرغا بھی تھا

بیوی بچّوں کے مسائل نے مجھے جیت لیا
چاند یادوں کا تری ڈوب گیا دھیرے سے

عجلت میں ہوں ابھی نہ سُنا پاؤں گا تُجھے
میں نے جو نظم تجھ پہ لکھی ہے طویل ہے

کچن میں شب گئے برتن کھنکنے لگتے ہیں
یہ کس کی یاد دبے پاؤں گھر میں آتی ہے

عجیب کرب تھا اِس سال بارشوں میں ندیمؔ
کس کی یاد ٹپکتی رہی چھتوں کی طرح

رنجشیں دانت میں انگلی لئے بیٹھی ہیں ندیمؔ
وہ چلا آیا ہے تنہائی کو مہکاتا ہے

منظور ندیمؔ نے پابند آزاد اور نثری نظمیں بھی کہی ہیں جن میں ''بھوپال گیس ٹریجڈی'' ''یومِ سیاہ'' ''گجرات میں زلزلہ'' ''عید اور آر ڈی اکس'' ''واپسی، اعتراف'' ''آہ پروین شاکر'' ''سنہری یاد، جوابِ خط وغیرہ ان کی مؤثّر نظمیں ہیں لیکن ان میں پابند نظموں کا پلڑہ بھاری ہے۔ البتہ ان کی مقبولیت اور شہرت میں نظموں سے زیادہ ہاتھ ان کی غزلوں کا ہے اور غزل انھیں سجتی بھی ہے۔ بلا تردُّد کہا جا سکتا ہے کہ منظور ندیمؔ غزل کے ماہرِ فن اور مقبولِ عام شاعر ہیں۔

ایڈیٹر بین الاقوامی ماہنامہ ''صدا''
خندہ بھون، نوا کدل
سری نگر، کشمیر ۱۹۰۰۰۲

سب کو منظور میرا ندیم

از : ڈاکٹر قاسم امام (بمبئی)

وی ٹی سے ریل چھوٹتی اور دادر تک آتے آتے اُن کی شگفتگی ساری کھڑکیاں کھول دیتی' دروازہ بھی کھلتا ہے۔ چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد' ناسک، جلگاؤں، بھساول، اکولہ، ناگپوران کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ہمیں کبھی کوئی اسٹیشن اجنبی نہیں لگا۔ ہر اسٹیشن پر انجم رومانی صاحب سے ملنے والے اہتمام سے منتظر نظر آتے۔

باغ و بہار شخصیت انجم رومانی کو ادبی شخصیتوں کے بڑے دلچسپ قصّے یاد تھے۔ مرحوم اگر خودنوشت لکھتے تو اردو ادب میں ایک یادگار اور تاریخی دستاویز مرتب ہوجاتی۔ بار بار کے اصرار کے باوجود وہ بے چراغ لمحوں کی روشنی سے باہر نہیں گئے۔ زندگی بھر لوح وقلم کی پرورش کرتے ہوئے اپنے سفر کو قہقہوں، شوخ اور چست جملوں سے یوں طے کیا کہ آج بھی لوگ باگ اُن کو یاد کر کے من ہی من بلکہ ہزار من مسکراتے ہیں۔

مجھے یاد نہیں وہ کونسا اسٹیشن تھا جہاں منظور ندیم سے انجم صاحب نے ملوایا تھا۔ شولا پور کے ایک مشاعرے میں انجم صاحب، ظفر گورکھپوری اور قیصر الجعفری، کے ساتھ مَیں بھی شریک تھا۔ منظور ندیم سے تفصیلی ملاقات وہیں ہوئی۔ وہ سردیوں کی رات تھی۔ مشاعرے کے بعد مخصوص گرم محفل میں انجم رومانی آتش دان بنے ہوئے تھے۔ اور ہم سب اُن کے اِرد گرد جمع تھے۔ دلچسپ واقعات، ادبی لطیفے، وتیج نان وتیج قہقہے ..... بالآخر منظور ندیم سے ہوئی ملاقات اگلی ملاقات کے وعدے پر ختم ہوئی۔ نشستاً مشاعرتاً اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ دھیرے دھیرے اپنے کورٹ روم سے باہر آتے گئے۔ منظور ندیم کو منظورِ نظر بننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

اب میں سوچنے بیٹھا ہوں تو ساری باتیں ایک فلمی سین کی طرح میری آنکھوں کے سامنے جل بجھ رہی ہیں۔ ہر فریم میں وہ دوستوں کی بھیڑ میں ہیں۔

زندگی کے پیچ و خم، حسب و نسب کی اساس، مٹّی کی بوباس، وراثت کی مٹھاس اور طرزِ بودوباش سے سنورتے ہیں۔

شیگاؤں سے اکولہ کی طرف جاتے ہوئے ۱۹؍کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر بالا پور جسے تاریخی شہر کہنا زیادہ مناسب ہے، آباد ہے۔

تہذیب وثقافت کے اعتبار سے بلند و بالا، بالا پور دور ہی سے عظمت کا پتہ دیتا ہے۔

شیگاؤں سے اکولہ جاتے ہوئے جب بھی مَیں نے شہر کی طرف دیکھا' مجھے وہ کشتی نُما پہاڑ نظر آیا۔ تاریخی عمارات، قلعہ، مساجد کے مینار، جنگل سے ہوتے ہوئے دھوپ کے راستے، نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے موسموں کے سلسلے ایک عجیب سی کیفیت منظر نامے میں پیدا کرتے ہیں۔

مغل دورِ حکومت کا ایک عظیم فوجی مرکز بالا پور، اکبر کے فرزند شاہ مراد نے برار میں سکونت اختیار کی تو بالا پور کو اپنا صدر مقام بنایا۔ کہتے ہیں یہاں کی مٹّی میں عبدالرحیم خانِ خاناں کی مہک بھی ہے۔

یہ میری بدقسمتی ہے کہ یہاں کی ادبی روایتوں اور شخصیتوں کا مجھے علم نہیں، بعد کے زمانے میں یہاں کے شعری اُفق پر جو نام اُبھرے، ان میں سردار خان اثرؔ، غلام حُسین رازؔ بالاپوری اور منظور ندیم نمایاں ہیں۔ ممکن ہے اور بھی اہم نام ہوں جو میری کم علمی کی نذر ہو گئے، مگر فی زمانہ اِنٹرنیٹ کے اسکرین پر بالا پور کے حوالے سے مذکورہ تین نام ہی نظر آتے ہیں۔

بالا پور تین ندیوں کا حسین سنگم بھی ہے۔ بھینس اور بھکنڈ آکر یہاں من بنتے ہیں۔ روایتی غزل سے جدید غزل تک منظور ندیم کی شاعری بھی خوبصورت ہے۔ من ندی کی طرح۔

ان کا شعری سفر مختلف شہروں اور شاہ راہوں سے گزرتے ہوئے اپنے محور اور مرکز پر جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ تازہ دَم ہو جاتا ہے۔

بالا پور کا موروثی پیشہ کاشت کاری اور شطرنجی بنانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منظور ندیم کی شاعری نفاست، مہین کاری اور حُسن کاری سے مزّین ہے۔ وہ روایت کے پاسدار ہیں اور یہ پاس داری انھیں والد بزرگوار حضرت رازؔ بالا پوری سے وراثت میں ملی ہے اور جدّت اُن کی آنکھوں کا وصف ہے۔ روایت میں شدّت اور جدّت میں جدید ترین جدّت اُن کا خاصہ ہے۔

اہلِ جنوں اس عہدِ خرد میں ہیں نایاب
جشنِ صلیب و دار تو اب نئیں ہونے کا
دن ڈھلے تک ڈھونڈیے اچھی سی کوئی نوکری
اوڑھ کر سو جائیے، وعدوں کی چادر رات کو
سوچا کہ دو ٹکے میں بھی ڈگری نہ بِک سکی
کل بیچ آؤں گا ترے کانوں کی بالیاں

منظور ندیم کے یہاں روایت اور جدّت کے درمیان بڑا فاصلہ ہے، یہ عیب بھی ہے اور ہُنر بھی........ فکر میں وسعت ایسی کہ علاقۂ برار کی آخری سرحد سے ساحلِ بمبئی کو دیکھ لیتے ہیں۔

مُجھے تلاشیے کہ مَیں یہیں کہیں ہوں دستیاب
جدیدیت کی بھیڑ میں، روایتوں کے درمیاں

منظور ندیم کی شاعری پر چند لفظوں میں کوئی رائے قائم کرنی ہو تو میں کہہ سکتا ہوں۔

امتزاجِ جدید و قدیم   سب کو منظور میرا ندیم

ملازمت کے دوران مختلف شہروں کے قیام نے اُن کی شاعری کے موضوعات بھی بدلے،

رویّے اور اسلوب میں تجربے و مشاہدے کے نئے رنگ بھی شامل کیے۔ سرکاری نوکری نے انھیں گھاٹ گھاٹ کا پانی پلایا۔ وہ 'دیول گھاٹ' گئے یا نہیں اس بات کی ہنوز تصدیق نہ ہو سکی۔ اپنے عارضی مکان کو ہمیشہ اس نفاست سے رکھا کہ مستقل کا گمان ہُوا۔ غرض یہ کہ جہاں رہے ٹھاٹ باٹ سے رہے۔ اور اس ٹھاٹ باٹ کو دوستوں میں بانٹا بھی۔ اورنگ آباد پیٹھن کا تقرر تو وہ زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔

لفظ ''پرواز'' سن کر اب بھی وہ سٹ پٹا کر بنا پروں کے اُڑنے لگتے ہوں گے۔ مرحوم انجم رومانی کے اندازِ بیان نے اس دل خراش واقعے کو نا قابلِ فراموش بنا دیا۔ صاحبِ میزان منظور ندیم سیشن جج کے منصب سے ریٹائر ہوئے مگر آج بھی جوان لگتے ہیں۔ اس میں صرف ان کے سفاری سوٹ اور گہرائے ہوئے بالوں کا ہی عمل دخل نہیں، بلکہ خوش باش شخصیت کا بھی ہاتھ ہے۔ شاعری ورثے میں ملی اور پیشۂ منصفی حوصلے اور ہُنر سے۔

بات بات پر سر ہلانا، ان کی سرشت میں شامل ہے۔ اچکنا دیکھنا ثابت کرتا ہے کہ ملزم کو مجرم گردانتے ہوئے یقیناً وقت لیتے رہے ہونگے۔ ان کی نظر میں شاید سارے مجرم بونے ہوتے ہیں اسی لیے وہ حیرت سے اُچک کر ان کو دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ ذاتی ملاقات میں دوستوں کو اُچک کر لپک لینا ان کی مخصوص ادا ہے۔

ستم ظریفی دیکھیے۔ ہزاروں کی گرفتاری کا حکم صادر کرنے والے جج منظور ندیم اردو شاعری کے اسیر ہو گئے۔ عدالت میں کسی فیصلے کے دوران انھوں نے شعر پڑھا، یا نہیں یہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اپنی شاعری میں اکثر وہ فیصلہ کُن گفتگو کرتے ہیں۔

تم تو خود ایک گنہگارِ محبّت ہو ندیم
پھر دیا کرتے ہو اوروں کو سزائیں کیسے
کیسے سُنائیں ترکِ تعلق کا فیصلہ
کم بخت اپنا دل ہی کسی کا وکیل ہے

اپنی ذات سے کائنات کو ایک نظر میں دیکھنے والے منظور ندیم اپنے دل کو احسان جعفری کا مکاں بتاتے ہیں۔ جسے جلا کر دُنیا مسکراتی ہے۔

ہمارا دِل بھی ہے احسان جعفری کا مکاں
جَلا کے لوگ جسے مسکرا کے دیکھتے ہیں

جلتا ہُوا مکان استعارہ ہے پُر آشوب حالات کا........اور دل اشاریہ ہے درد کا۔ جلتے ہوئے مکان کو وہ منصف کی عینک سے دیکھتے ہیں اور سامنے مظلوم کے کٹھرے میں بھی خود کو پاتے ہیں۔

مزاج کی یہ تلملاہٹ، ان کے شعری روّیے میں جا بجا زندگی سے جھوجھتی نظر آتی ہے۔

منظور ندیم کو جس شعر سے غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہی ایک شعر اُن کی شعری بخشش کے لیے کافی ہے۔

ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے

اس شعر میں موصوف کی طویل عمری کا راز پنہاں ہے۔

اسکول کے زمانے میں بیت بازی کی مشق کے دوران بچّے باوضو ہو کر اس شعر کو ازبر کرتے اور بار بار حکیم الامّت علامہ اقبال کو خراجِ تحسین وعقیدت پیش کرتے نیز مغفرت کی دعائیں بھی مانگتے ہیں۔ جب یہ انکشاف ہُوا کہ یہ شعر مرحوم علامہ اقبال کا نہیں بلکہ منظور ندیم کا ہے جو باحیات ہیں تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اسکول کی سطح پر ہونے والے بیت بازی کے مقابلے میں اُردو طلباء علامہ اقبال سے منسوب کر کے یہ شعر سُناتے رہے اور اساتذہ انھیں انعام واکرام سے نوازتے رہے۔

یہاں کسی طرح کا کوئی موازنہ مقصد نہیں بلکہ یہ ایک ایسا جرم ہے جو ہو بھی نہیں سکتا یہ غیر

دانستگی اور کم علمی کا فیض تھا۔

مجروح سلطانپوری اکثر اپنی پٹھانی شیروانی کے قیمتی بٹن درست کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ میرے کئی اشعار، پاکستان میں فیض کے نام سے مشہور ہیں۔

سچ بات تو یہ ہے کہ جو منظور ندیم کو نہیں جانتے وہ بھی مذکورہ شعر سے واقف ہیں۔

حسّاس ملازمت کے دوران بھی وہ شاعری کو شدّت سے محسوس کرتے رہے اور اپنے آپ کو پابند بناتے رہے لیکن یہ پابندی انھیں قید نہ کر سکی۔

کیسے مانوں کہ تجھے باندھ کے رکھتا ہے کوئی
خوشبوؤں کو بھی کہیں قید کیا جاتا ہے؟
عدلیہ باندھ کے رکھے گی مجھے تُو کب تک
تیرا اس فطرتِ آزاد سے رشتہ کیا ہے؟

ذاتی ملاقاتوں میں وہ ہمیشہ انجم رومانی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ بمبئی کے حوالے سے بھائی ندیم صدیقی، شاہد ندیم، شاہد لطیف اور فاروق سیّد کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس رنج کے ساتھ کہ وہ لوگ انھیں بھول گئے۔

ان کی طبیعت میں عجلت تو ہے، استقامت بھی ہے.........اطاعت، قناعت اور شکایت بھی ہے۔ اپنی گوشہ نشینی پر شکر ادا کرتے ہیں۔ مگر شکایت کے ساتھ۔

ہم گوشہ نشینی میں بھی خوش ہیں‘ یہ الگ بات
یاروں کی مگر اس میں سیاست بھی بہت ہے

منظور ندیم کی مقبولیت اور محبوبیت دونوں میں ایک شان ہے اور ادائے دلبری بھی۔

اس حوصلے کی داد کوئی دے نہ دے ندیم
مدّت سے اس کی یاد میں رویا نہیں ہوں میں

ان کا پہلا شعری مجموعہ ’دھوپ کا درخت‘ روایت اور جدیدیت کا خوبصورت

امتزاج ہے۔ جو یقیناً ادبی حلقوں میں قبولیت کی سند حاصل کرے گا۔

تاریخ پہ تاریخ، تاریخ پہ تاریخ کے درمیان اردو کی شعری و ادبی تاریخ میں اپنا نام درج کروانے والے منظور ندیم میں ایک باوقار مقام حاصل کرنے کے بھرپور امکانات ہیں۔

یہ خاکہ نما مضمون جواب بھی نامکمل ہے.......... انتظار کر رہا ہے اس ادبی عدالت کا جس میں آنے والا وقت چشم دید گواہ بن کر آئے گا، جرح ہوگی.......... دلیلیں پیش کی جائیں گی اور منظور ندیم کی شاعری کو باعزّت بری کیا جائے گا۔

ڈاکٹر قاسم امام
صدر شعبۂ اردو، برہانی کالج ممبئی

ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے

غزلیات

و

متفرّقات

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ....

(نومبر ۲۰۱۱ء میں دورانِ حجّ بیت اللہ مکّہ معظمہ میں کہی گئی۔)

ہے کرم تیرا ' عطا ایسی سعادت کرنا
مجھ کو راس آئے ترے گھر کی زیارت کرنا

ٹوٹا پھوٹا سا ہُوں انساں' ترے دربار میں ہوں
مُجھ کو آئے نہ سلیقے سے عبادت کرنا

زندگی بھر کے گناہوں کا مگر ہے احساس
مجھ پہ بھی وا کسی ساعت درِ رحمت کرنا

مغفرت کے تو رواں ہیں یہاں چشمے ہر سُو
بس فراہم مجھے اِک جامِ فضیلت کرنا

کچھ بھلے کام بھی کر بیٹھا ہوں شاید' ورنہ
مُجھ سیہ کار کی یوں تو نے ضیافت کرنا

دولت و عزّت و شہرت کی نہیں اب چاہت
خاکساری کی ودیعت مجھے نعمت کرنا

اب تلک جو بھی کٹی اُس کیلئے سرخم ہے
ہے جو باقی اُسے پابندِ شریعت کرنا

کنکری مار کے زخمی اُسے کر آیا ہوں
میرے مولا مری شیطاں سے حفاظت کرنا

محمد رسول اللہ

(ادائیگیٔ فریضۂ حج کے بعد مدینہ منورہ میں کہی گئی۔)

نحیف خود کو تونگر لگا مدینے میں
مِلا جو قُربِ شہہِ انبیاء مدینے میں

تھی شرم کیسے کروں مغفرت خدا سے طلب
قسم خدا کی' ہُوا حوصلہ مدینے میں

جو دھوپ غیظ و غضب کی تھی مسکرا اُٹھی
جسے عتاب کہیں ہنس پڑا مدینے میں

تھا رحمتوں کا گھنا پیڑ سر پہ سایہ فگن
عجیب ایک تحفّظ مِلا مدینے میں

''نہ خالی ہاتھ درِ مصطفیٰ ﷺ سے لَوٹو گے''
دلاسہ دیتی رہی یوں صبا مدینے میں

سکونِ دل جہاں ملتا ہے خوش نصیبوں کو
ہے دستیاب وہ دَارُالشِّفاء مدینے میں

''جو بند تھا درِ قسمت' کہاں کھُلا منظور؟''
کسی نے پوچھا' تو مَیں نے کہا ''مدینے میں''

ندیمؔ اشک بہے اس قدر ندامت کے
جو دل پہ بوجھ تھا سب چھٹ گیا مدینے میں

درد کے کھیت میں مُسکان اُگانے والا
کتنا خوش ظرف ہے زخموں کو چھپانے والا

دل میں اخلاص' وفاؤں کی ہے گٹھری سر پر
آدمی ہے یہ کسی اور زمانے والا

یاد آتا رہا تا دیر سفر میں مجھ کو
ہاتھ رہ رہ کے دریچے سے ہلانے والا

آگ کچھ اور گھروں کو بھی جلا ڈالے گی
سوچتا کاش مرے گھر کو جلانے والا

لوگ چہروں کو چھُپائے ہوئے پھرتے ہیں ندیمؔ
شہر میں آیا ہے آئینہ دِکھانے والا

برس کے دشتِ تمنّا پہ بادلوں کی طرح
گزر گیا کوئی خوشبو کے موسموں کی طرح

ترا پڑوس بھی پا کر نہ کھُل سکی قسمت
پڑی ہے بند ترے گھر کی کھڑکیوں کی طرح

جو ہم بُجھے تو کئی دیپ جگمگا اٹھّے
ہم اپنے شہر میں روشن تھے مشعلوں کی طرح

مَیں وہ خطوط بھی تیرے جلا نہیں پایا
گرے تھے شیشۂ دل پر جو پتھّروں کی طرح

عجیب کرب تھا اِس سال بارشوں میں ندیمؔ
کسی کی یاد ٹپکتی رہی چھتوں کی طرح

جوابِ خط

مدّتوں بعد نہ باقی تھا یہ امکاں جاناں
خط اچانک ترا پا کر ہُوں مَیں حیراں جاناں

کون کہتا ہے کہ مَیں بھول گیا ہُوں تجھ کو
تُو کہ ہے آج بھی پیوستِ رگِ جاں جاناں

اب بھی آتا ہے خدا یاد تجھے دیکھے سے
آج بھی تُو ہے مجھے دشمنِ ایماں جاناں

جس پہ کھلتے تھے مسلسل مری چاہت کے گلاب
ہے نظر میں ترے رُخ کا وہ گلستاں جاناں

ہاں پہ اب خُوئے وفا تجھ میں وہ پہلی سی نہیں
اب کہاں تُو ہے مرے درد کا درماں جاناں ؟

تُو کسی موڑ پہ دیکھے نہ پلٹ کر مجھ کو
مَیں پُکارا کروں ہر موڑ پہ ''جاناں جاناں''

تُجھ کو چھُونے سے بدن پر ترے آنچ آتی ہے
کیسے سلجھاؤں تری زُلفِ پریشاں جاناں ؟

اِک ذرا تیرے روّیے سے گِلہ ہے' ورنہ
دل میں ہر دم تری چاہت کا ہے ارماں جاناں

گیسو جدیدیت کے پریشان ہوگئے
ہم یوں روایتوں کے نگہبان ہوگئے

اہلِ جنوں بھی آ گئے گھاتوں میں عقل کی
اب راستے وفاؤں کے سنسان ہوگئے

طائر ہیں' قید و بند مگر جھیلتے ہیں ہم
گلشن کے پھول زینتِ گلدان ہوگئے

سر سے انا کا بوجھ اُترنے کی دیر تھی
سب مرحلے حیات کے آسان ہوگئے

احباب جو بچے ہیں وہ بے فیض ہیں ندیم
جو کام کے تھے وہ تو مسلمان ہوگئے

○

ہم کرب کے حصار سے باہر نہیں گئے
تجھ سے بچھڑ کے زندہ رہے، مر نہیں گئے

کانوں میں آج تک تری سرگوشیاں سی ہیں
آنکھوں سے اب بھی جھیل کے منظر نہیں گئے

چُپکے سے آ گیا مَیں قیامت کو ٹال کر
اُن کو گلہ یہ رہ گیا، مِل کر نہیں گئے

پیچھے رہے ہیں گھر وہ ترقّی کی دوڑ میں
جن کی چھتوں پہ وقت کے پتھّر نہیں گئے

خودداریوں کا بوجھ تھا کاندھوں پہ اے ندیم
پیاسے رہے پہ سُوئے سمندر نہیں گئے

○

"یومِ سیاہ"

(بابری مسجد کی شہادت، ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء)

آج اک تیر چلا
آج اس ملک کے سینے میں ہوا ایک شگاف
آج اک داغ لگا
آج اس ملک کے دامن کی سفیدی پہ سیاہی پھیلی
آج اک دیپ بُجھا
آج اس ملک کے تابندہ اُجالوں کا بھرم ٹوٹ گیا
آج اک قتل ہُوا
آج اک چیخ سی یکلخت فضا میں اُبھری
آج اک ہاتھ بڑھا
آج اس ملک کے آئین کا سر ہو گیا خم
آج اک درد اُٹھا
آج اس ملک کے قانون کی آنکھوں میں نمی در آئی
آج کا درد کئی سال کئی صدیوں تک
سینۂ ہند میں محسوس کیا جائے گا......!!

لگا تھا دل کو جو آزار ' لا دوا نکلا
تمھارے غم کا تو انداز ہی جُدا نکلا

فرشتوں جیسا تقدّس تھا جس کے چہرے پر
وہ اپنی ذات میں شیطان سے سِوا نکلا

بَلا سے ہاتھ میں پتھّر تھے اہلِ دُنیا کے
ہمارا دل بھی تو کمبخت کانچ کا نکلا

جو دُور تھے تو کئی لوگ مجھ سے تھے نزدیک
قریب آئے تو میلوں کا فاصلہ نکلا

پرائے درد کو سمجھے تھے ہم عذاب ندیمؔ
پرایا درد تو جینے کا آسرا نکلا

خلوص ' پیار ' وفا آزما کے دیکھتے ہیں
ہم اب بھی دھوپ میں پودے لگا کے دیکھتے ہیں

ہمارا دل بھی ہے احسان جعفریؔ[1] کا مکاں
جَلا کے لوگ جِسے مسکرا کے دیکھتے ہیں

وہ اپنے درد کی تاثیر ' اُس کی تابانی
ہماری پلکوں پہ موتی سجا کے دیکھتے ہیں

شناخت رکھتے ہیں سارے جہاں میں ہم اپنی
پہ ہموطن ہمیں عینک لگا کے دیکھتے ہیں

جلائے رکھتے ہیں ہم آندھیوں کی زد پہ چراغ
وہ اور ہونگے جو تیور ہَوا کے دیکھتے ہیں

خوشی جب آتی ہے بھُولے سے میرے در پہ ندیمؔ
تو گھر کے غم بھی مجھے مُسکرا کے دیکھتے ہیں

---

۱ سابق ممبر آف پارلیمنٹ احمد آباد' جن کو ان کے ۱۸ر افرادِ خانہ کے ساتھ گجرات کے فرقہ وارانہ فسادات (مارچ ۲۰۰۲ء) کے دوران ان کے گھر میں زندہ جلا دیا گیا۔

زخم جھیلے ہیں بہت خاک بہت چھانی ہے
زندگی تجھ سے مگر ہار کہاں مانی ہے ؟

قدر کر لو غمِ جاناں ہے اگر آج نصیب
ورنہ ہاتھوں سے یہ دولت بھی نکل جانی ہے

تنگ دستی میں بھی حاوی ہوں مَیں زرداروں پر
یہ جو حاصل مجھے جذبوں کی فراوانی ہے

شاعری کب کسی مُنصف کی ہے پہچان یہاں
اس ریاست میں کہاں کوئی مِرا ثانی ہے ؟

میرے مولا، مرے دامن میں اندھیرے کیونکر
میرے ذِمّے تو اُجالوں کی نگہبانی ہے

کیا کروں نذر، کہ سکتہ ہے قلم پر طاری
روحِ[1] انجم سے بہت مجھ کو پشیمانی ہے

[1] انجم رومانی مرحوم

(۱۹۹۲/ ۹۳ء میں ملک کے حالات)

پھر آج فرقہ پرستی کے بول بالے ہیں
فضا میں کس نے یہ نیزے یہاں اُچھالے ہیں؟

ہے کون، مندر و مسجد کی سیڑھیاں چڑھ کر
دِلوں میں جس نے عداوت کے بیج ڈالے ہیں؟

عجیب رُت ہے، سلگتا ہے اِن دِنوں پنجاب
مزاج وادیٔ آسام کے نرالے ہیں

سری نگر پہ بھی بارود کا دھواں ہے محیط
جو برف پوش مناظر تھے آج کالے ہیں

جو ذات پات کی کُنجی سے کھولے جائیں گے
ملازمت کے کواڑوں پہ اب وہ تالے ہیں

نہ جانے تیز ہَوا لے اُڑی کہاں اُن کو
سُنا تو یہ تھا کہ بادل برسنے والے ہیں

اِک عمر بعد مُجھے کوئی جیت پایا ہے
بڑے دِنوں میں تمنّا نے پر نکالے ہیں

ترے وطن کو نظر کس کی لگ گئی ہے ندیمؔ ؟
یہ کیسی صُبح کہ سہمے ہوئے اُجالے ہیں!!

غنچہ کوئی مُسکائے تو لگتا ہیکہ تم ہو
خوشبو سی بکھر جائے تو لگتا ہیکہ تم ہو

کچھ ایسی ادا سے کہ نہ بُجھ پائے مری پیاس
گاگر کوئی چھلکائے تو لگتا ہیکہ تم ہو

"غم اور بھی دُنیا میں محبّت کے سوا ہیں"
مجھ کو کوئی سمجھائے تو لگتا ہیکہ تم ہو

فرقت کے اندھیروں میں کسی شب جو اچانک
جگنو سا چمک جائے تو لگتا ہیکہ تم ہو

نازک سی ' مرے شیشۂ دل جیسی کوئی شئے
پتھر سے جو ٹکرائے تو لگتا ہیکہ تم ہو

''ہیں ساتھ' ترا ساتھ نہ چھوڑیں گے کبھی ہم''
قسمیں جو کوئی کھائے تو لگتا ہیکہ تم ہو

نغمہ کہیں خاموش پہاڑوں سے جو پھوٹے
جھرنا کوئی لہرائے تو لگتا ہیکہ تم ہو

غربت میں کسی یاد کا جھونکا جو سرِ شام
احساس کو مہکائے تو لگتا ہیکہ تم ہو

تا عمر جتن کرکے کمائی ہوئی دولت
بانہوں میں جو آجائے تو لگتا ہیکہ تم ہو

جب چاندنی دنیا کو وہ بانٹے تو لگے چاند
آنگن میں اُتر آئے تو لگتا ہیکہ تم ہو

''شاباش ٹیم انڈیا''

(۲۷ ستمبر ۲۰۰۷ء کو ساؤتھ افریقہ میں ٹونٹی ٹونٹی اوورس کے ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ میں پاکستان کے خلاف فائنل میچ کھیلتے ہوئے ہندوستان نے جیت حاصل کی۔ دوسرے روز میں نے کہا......)

غضب کا ولولہ تھا ' ہاتھ میں تلوار ننگی تھی
ہماری ٹیم کل میدان میں جس وقت اُتری تھی

مہندر سنگھ دھونی فوج کے کپتان تھے یارو
غضب کے فارم میں گمبھیر اور عرفان تھے یارو

سچن تھا درمیاں اُن کے' دراوڑ تھا' نہ گنگولی
مُرتّب کر گئی تاریخ پھر بھی اک نئی ٹولی

ہوئی جم کر لڑائی' بم گرے چوکوں کے' چھکّوں کے
عجب دریا میں ہلچل تھی' عجب تیور تھے جھرنوں کے

ہمیں ڈر سا دمِ آخر لگا ' دشمن ہُوا حاوی
پہ اک مصباح[۱] کی ناکام ہِٹ نے جیت دِلوائی

خدا کا شکر ہم کو سُرخروئی ہوگئی حاصل
جو تھی گاڑھے پسینے کی کمائی ' ہوگئی حاصل

ہراک چہرے پہ جو چھائی ہے اُس رنگت گلابی پر
مبارکباد سارے ملک کو اس کامیابی پر

مگر کرکٹ کو بس اِک کھیل تک محدود رکھنا ہے
پڑوسی سے ہو یارانہ ' یہی مقصود رکھنا ہے

بہت ہے' ورلڈ کپ پر ایشیاء نے ہاتھ مارا ہے
نہ ہندوستان جیتا ہے' نہ پاکستان ہارا ہے

(۱ پاکستان کا کھلاڑی مصباح الحق' جو میچ کے آخری اوور میں ایک غیر ضروری چھکہ لگانے کی کوشش میں کیچ آؤٹ ہو کر اپنی آخری وِکٹ گنوا بیٹھا' جس کی وجہ سے پاکستان کی ٹیم یہ فائنل میچ ہار گئی۔)

کسی کی یاد کے جگنو سمیٹ لاتے ہیں
اندھیرے پھر مری راتوں کو جگمگاتے ہیں

تعلّقات ہوں زرخیز تو سر آنکھوں پر
ہوں بے ثمر تو کہاں لوگ اب نبھاتے ہیں ؟

جو تھام کر مری انگلی چلے ہیں برسوں تک
وہی ہیں مجھ پہ جو اَب اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں

ہیں ایک عمر کی میری کمائی پر حاوی
وہ اشک جو تری آنکھوں میں جھلملاتے ہیں

ستا رہا ہے مرا درد کس نفاست سے
وہ محفلوں میں مرے شعر اب سُناتے ہیں

چُپ کا عالم سامنے، اظہار پس منظر میں ہے
اُس کے ہونٹوں پر نہیں، اقرار پس منظر میں ہے

قوم کی خدمت بظاہر ہے سیاست کا اُصول
اور جو چلتا ہے کاروبار، پس منظر میں ہے

قتل میرا، دشمنوں کے گھر تلاشی بار بار
دوستوں کے ہاتھ کی تلوار پس منظر میں ہے

نوکری کی مصلحت منظر پہ میرے ساتھ ساتھ
شخصیت میری پسِ دیوار، پس منظر میں ہے

چُبھ رہی ہیں میری خوشیاں سب کی آنکھوں میں ندیمؔ
ہے غموں کو وہ جو اک انبار، پس منظر میں ہے

عجب رہگیر ہیں، منزل کا رستہ بھول جاتے ہیں
وہ پیاسے ہم، کہاں بہتا ہے جھرنا بھول جاتے ہیں

ہمارا ذوقِ نظارہ بہت اعلیٰ، بجا لیکن
اُسے دیکھیں تو جانے کیوں سلیقہ بھول جاتے ہیں

پہنچتے ہیں ہمارے شعر اس انداز میں اُن تک
ہم اُن کے گھر کبھی کوئی رسالہ بھول جاتے ہیں

تصوّر میں کبھی ایسا بھی اک عالم گزرتا ہے
ہم اُن کو یاد کرتے ہیں پہ چہرہ بھول جاتے ہیں

جتن کر کے جسے ہم رات بھر ترتیب دیتے ہیں
وہ مضموں صبح اُن کو خط میں لکھنا بھول جاتے ہیں

ہے سرد سا کسی کے جوابات کا بدن
تنہا جلے ہے میرے سوالات کا بدن

بچ کر جدید لہجے کی تازہ ہواؤں سے
بیمار ہو نہ جائے روایات کا بدن

موسم کا لُطفِ خاص کوئی ساتھ لے گیا
سوکھا دِکھائی دیتا ہے برسات کا بدن

ہے جی حضوریوں پہ تب وتاب اِن دِنوں
مجروح ہو چکا ہے کمالات کا بدن

چھُو اس کو اے اسیرِ تمنّا ادب کے ساتھ
نازک بہت ہے اُن کی عنایات کا بدن

پتھر سا سخت اُن کا روّیہ ہے اے ندیمؔ
پھولوں سا نرم ہے مرے جذبات کا بدن

آہ' ساحرؔ لدھیانوی

سُخن کے سحر سے مسحور کر گیا ساحرؔ
پیامِ زیست ہمیں دے کے مرگیا ساحرؔ
گزر گیا ہے وہ خوشبو کے موسموں کی طرح
پہ اُس کی یاد کی ''پرچھائیاں'' سی باقی ہیں
مٹھاس لہجے کی لے کر چلا گیا لیکن
کتابی شکل میں کچھ ''تلخیاں'' سی باقی ہیں
نہ جانے کتنے دِلوں میں اُتر گیا ساحرؔ
پیامِ زیست ہمیں دے کے مرگیا ساحرؔ
وہ دل، جو قوم کی مظلومیت پہ روتا تھا
وہ دل، جو جذبۂ حُبِّ وطن سے تھا سرشار
وہ دل، دِلوں کو دھڑکنے کی دی ادا جس نے
وہ دل ہی کر گیا حرکت سے یک بیک انکار

خود اپنے دل ہی کے ہاتھوں بکھر گیا ساحرؔ
پیامِ زیست ہمیں دے کے مر گیا ساحرؔ

وہ چاہتا تھا کہ شاعر نئے زمانے کے
نئی ادا سے نئی فکر کے گلاب چُنیں
تمام عمر اُلجھتا رہا حقائق سے
پکارتا رہا ''آؤ کہ کوئی خواب بُنیں''
یہ کہہ رہی ہے ہر اک چشمِ تر ''گیا ساحرؔ''
پیامِ زیست ہمیں دے کے مر گیا ساحرؔ

امر ہے اُس کی غزل فن تو اُس کا زندہ ہے
بلا سے راس نہیں آئی زندگی اُس کو
دیئے ہیں اُس نے زمانے کو گیت لافانی
ندیمؔ مدّتوں روئے گی شاعری اُس کو
ادب کی آنکھ میں کچھ اشک بھر گیا ساحرؔ
پیامِ زیست ہمیں دے کے مر گیا ساحرؔ

جیسے جیسے مرے افکار پہ لہرائے غزل
ویسے ویسے پسِ پردہ کوئی شرمائے غزل

غمِ ہستی، غمِ دُنیا، غمِ دل، فکرِ معاش
کیسے سُلجھائے کوئی گیسوئے لیلائے غزل

بیٹھ کر جب مَیں اکیلے میں کروں فکرِ سُخن
بانہیں پھیلائے تصوّر میں چلی آئے غزل

آئینہ گر مَیں دِکھاؤں تو بُرا مانو گے
دوستو اب نہ کرو مجھ سے تقاضائے غزل

خوب زُلف و لب و رُخسار کے چرچے، لیکن
اِن مضامین سے ہٹ کر بھی کہی جائے غزل

دار و رسن کے گزرے ہیں اکثر قریب سے
حق گو ہیں ہم' ڈرا نہیں کرتے صلیب سے

کرلو "جنابِ عشق" کا جی بھر کے احترام
ایسے بزرگ ملتے ہیں یارو نصیب سے

سُنتے ہیں ہم ضمیر کی آواز شہر میں
مُفتی سے دوستی' نہ عداوت خطیب سے

رکھتے ہیں غم سنبھال کے پہلو میں ہر گھڑی
روتے نہیں لِپٹ کے کبھی ہم حبیب سے

گر ہو تضاد شعر و سُخن پر برار میں
"راہی"[1] سے پوچھ لیجئے یا پھر "نقیب"[2] سے

[1] محبوب راہی [2] فصیح اللہ نقیب

○

جسکے ہر لفظ میں پیمانِ وفا رکھا ہے
آج تک مَیں نے ترا خط وہ بچا رکھا ہے

تُو اگر خود بھی ٹٹولے تو نہ کچھ ہاتھ آئے
اس صفائی سے ترے غم کو چھُپا رکھا ہے

وہ ہے نادان کہ پتھر کے نگر میں جس نے
خود کو احساس کی سُولی پہ چڑھا رکھا ہے

دل پہ رکھ لینے سے تسکین سی ہو جاتی ہے
ورنہ اُس دستِ حنائی میں بھی کیا رکھا ہے

ہم نے تدبیر کی ہر زُلف سنواری ہے ندیم
اور تقدیر کو قدموں پہ جھکا رکھا ہے

پردیس میں بہت ہے، جو اتنا دکھائی دے
یارب کوئی پُرانا شناسا دکھائی دے

چلتے رہو کہ منزلِ مقصود یہ نہیں
یہ تو کسی کی زُلف کا سایہ دکھائی دے

اپنے عیوب آئیں نظر جس مقام سے
ہر شخص اُس مقام پہ اندھا دکھائی دے

اب تک ہے یاد گاؤں سے آنا وہ شہر میں
کھڑکی سے کوئی ہاتھ ہِلاتا دکھائی دے

ڈر سا لگے ہے پیاس کی شدّت سے اب ندیم
کیا جانے کیا ہو گر مجھے دریا دکھائی دے

قیامتِ صُغریٰ

(گجرات کے احمد آباد، بھج اور کچھّ علاقوں میں بھیانک زلزلہ مورخہ ۲۶/جنوری ۲۰۰۱ء)

چُپ سی ہونٹوں پہ ہے لگی، مت پوچھ
کیوں ہے آنکھوں میں یہ نمی، مت پوچھ

کٹ گئی بیسویں صدی لیکن
اُف یہ اکیسویں صدی مت پوچھ

ناگہانی قیامتِ صُغریٰ
کتنے جسموں کو کھا گئی مت پوچھ

موت کا رقص دیکھ کر ہر سُو
خون روتی ہے زندگی مت پوچھ

شہر کے شہر ہو گئے ویراں
نسلِ آدم کی بے بسی مت پوچھ

بے گھری کا عذابِ جاں لیوا
جھیلتی ہے گلی گلی، مت پوچھ

ماں کو روئے کہ باپ کو ننّھا
یہ گھڑی ہے عجب گھڑی مت پوچھ

دب گئی پتّھروں کے ڈھیر تلے
چند لمحوں میں ہر خوشی مت پوچھ

جشنِ جمہور کانپ کانپ اُٹھا
ہائے کیسی ہَوا چلی مت پوچھ

کتنی تاریک صبح لائی ہے
اب کے چھبّیس جنوری مت پوچھ

تری آنکھوں میں جو سمٹا ہُوا محسوس ہوتا ہے
ہے اک طوفاں مگر ٹھہرا ہُوا محسوس ہوتا ہے

طبیعت کس کے دامن سے لپٹ کر کیجئے ہلکی
یہاں ہر آدمی سہما ہُوا محسوس ہوتا ہے

بُجھا چہرہ، کھُلی زلفیں، لبوں پر مُہرِ خاموشی
جگر پر تیر سا چلتا ہُوا محسوس ہوتا ہے

ذرا تھم جائے دل کی تیز دھڑکن تو اِسے کھولوں
لفافہ عطر سے مہکا ہُوا محسوس ہوتا ہے

ندیم اس وادیٔ شعروادب میں ساتھ ہے سب کے
مگر انداز کچھ بھٹکا ہُوا محسوس ہوتا ہے

بہت عزیز ہے بانٹی نہ جائے ہے مجھ سے
متاعِ درد لُٹائی نہ جائے ہے مجھ سے

مَیں ایک گیت جسے تُو نہ گا سکے اے دوست
تُو ایک نظم جو لکھّی نہ جائے ہے مجھ سے

مَیں وہ کہ مجھ کو پڑھا ہے ورق ورق اُس نے
وہ اک کتاب جو کھولی نہ جائے ہے مجھ سے

یہ بے بسی کہ ترے غم کی دولتِ نایاب
بکھری پڑی ہے، سمیٹی نہ جائے ہے مجھ سے

مَیں اِس کو بیچ کے دُنیا خرید لُوں اے ندیم
مگر انا ہے کہ بیچی نہ جائے ہے مجھ سے

زخم ہوگا ہَرا، نہ پوچھو ہو
پیار، چاہت، وفا، نہ پوچھو ہو

ہے جو پیوست سارگِ جاں میں
خط ہے کس کا لکھا، نہ پوچھو ہو

ساری دنیا کی ہے خبر لیکن
ہم سے اپنا پتہ نہ پوچھو ہو

خوب تلقینِ صبر کر کے مجھے
جب وہ جانے لگا' نہ پوچھو ہو

نور ہی نور اُن کے چہرے پر
دل ہے کس کا جَلا نہ پوچھو ہو

سالِ نو کا ہے پیشگی تحفہ
چلتی بس[1] میں زِنا' نہ پوچھو ہو

رہبروں کی تو ہوگئی چاندی
قوم کا کیا ہُوا' نہ پوچھو ہو

قید ہو کر بھی کس قدر آزاد
میری فکرِ رسا نہ پوچھو ہو

۱؎ دہلی گینگ ریپ' ۱۶/ دسمبر ۲۰۱۲ء

ہمیں فتح کوئی نہ کرسکا' پہ یہ مات کسطرح کھا گئے ؟
بڑے کم سُخن' بڑے پُرسکوں' وہ جو دل میں آگ لگا گئے

جو مرے لبوں پہ ہے پھلجھڑی' مرے ذوق وظرف کی دین ہے
کہ جو دو جہاں کے تھے درد وغم' مری آنکھ میں وہ سما گئے

ہمیں ہر مقام پہ عمر بھر رہی میٹھے پانی کی جستجو
ہوئے کامیاب سمندروں سے جو اپنی پیاس بُجھا گئے

کبھی ضد پہ آئے تو یُوں ہُوا کہ گُلوں کو ہم نے چھُوا نہیں
جو تراش بیٹھے تو دھڑکنیں کبھی پتھّروں میں جگا گئے

وہ سلاؔم[1]، صاحبِ فکر و فن وہ جو بانٹتے تھے مسرّتیں
"وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دُکان اپنی بڑھا گئے"

رہا خواہشوں کا اسیر مَیں، تو کٹے کٹے سے رہے سدا
ہُوا بے نیازِ کرم تو پھر مِری دسترس میں وہ آ گئے

یہ وصال و ہجر کے موڑ بھی ہیں عجیب عشق کی راہ میں
کبھی اک کرن نہ ملی ہمیں، کبھی روشنی میں نہا گئے

بڑے منفرد ہیں ندیؔم جی، کریں عدلیہ میں بھی شاعری
اُٹھے سر زمینِ برار سے تو کہاں کہاں نہ یہ چھا گئے

[1] سلام عاؔمر صاحب مرحوم، کراچی

رات یُوں ہم پہ درِ فکر کھُلا دھیرے سے
کھول دے جیسے کوئی بندِ قبا دھیرے سے

تم پہ پھر شہر میں برسات ہوئی پھولوں کی
پاؤں میں پھر مِرے کانٹا سا چُبھا دھیرے سے

مجھ سے وحشت کا سبب پوچھ رہی تھی دُنیا
مَیں نے کاغذ پہ ترا نام لکھا دھیرے سے

اپنی فطرت سے عیادت میں بھی باز آئے کہاں
دوستوں نے مرے زخموں کو چھُوا دھیرے سے

بیوی' بچّوں کے مسائل نے مجھے جیت لیا
چاند یادوں کا تری ڈوب گیا دھیرے سے

جانتا تھا کہ مرے گھر پہ کڑے پہرے ہیں
دستکیں کوئی مگر دیتا رہا دھیرے سے

وہ بھی کم شوخ نہیں' اُس سے اُلجھتی کیوں ہے
چھیڑ اُس زُلف کو اے بادِ صبا دھیرے سے

تیز گامی یہاں اچھّی نہیں منظور ندیمؔ
رہگزرِ عشق کی نازک ہے' ذرا دھیرے سے

موسمِ خوشبو گزر گیا......................!!

(برِصغیر کی منفرد شاعرہ پروین شاکر کی حادثاتی موت مورخہ ۲۶/دسمبر ۱۹۹۴ء سے متاثر ہو کر)

بجلی سی اک گری ہے یکایک نہ پوچھیے
چُپ سادھ لی ہے کس نے اچانک نہ پوچھیے

فَن طرح دار' طرز وہ تیکھا نہیں رہا
حد درجہ منفرد تھا جو لہجہ' نہیں رہا

نازک، حسین جذبوں کی گلکاریاں گئیں
وہ دھیمی دھیمی آنچ، وہ چنگاریاں گئیں

عورت کے اعتماد کا عکسِ جمیل تھی
نظموں میں اُس کی ایک عجب سی اپیل تھی

کہنہ روایتوں سے بغاوت سی کر گئے
شعر اُس کے جسم وجاں میں حرارت سی بھر گئے

دُکھ لڑکیوں کے اُس نے غزل میں سمو دیئے
گھائل کِیا دِلوں کو، دو پٹّے بھگو دیئے

ناراض کتنی جلد اُجالوں سے ہوگئی
ہمدرد جگنوؤں کی اندھیروں میں کھو گئی

سر چڑھ کے بولتا تھا جو جادو اُتر گیا
وہ کیا گئی کہ موسمِ خوشبو گزر گیا

○

مجھے زہر دے، یہ دَوائی نہ دے
گرفتار کر کے رِہائی نہ دے

چمکدار اتنی ہے تہذیبِ نَو
بھلا کیا، بُرا کیا، سُجھائی نہ دے

ہیں دستِ مشقت کو چھالے عزیز
اسے بے مشقت کمائی نہ دے

ریا کاریوں پر جو موقوف ہو
خدا مجھ کو وہ پارسائی نہ دے

ہے شہنائیوں کی وہ چیخ و پُکار
صدا سسکیوں کی سُنائی نہ دے

مجھ کو یہ زندگی ہے شبِ تار کی طرح
مُسکان تیری صبح کے آثار کی طرح

وہ یُوں کہ جیسے بند ہو مُجھ پر کوئی کتاب
جس پر کھُلا ہُوا ہوں مَیں اخبار کی طرح

ساحل کی بھیگی ریت پہ جلنے لگے ہیں پاؤں
ہے تیری یاد بھی کسی آزار کی طرح

دریا سا وہ، پہ مجھ میں سمانے کو بے قرار
مَیں بُوند بُوند اُس کے طلبگار کی طرح

اک میری چھاؤں ہی میں ہو راحت اُسے نصیب
اور مَیں کسی شکستہ سی دیوار کی طرح

چہروں سے شخصیت کا پتہ کیا چلے ندیمؔ
ہر شخص اِن دِنوں ہے اداکار کی طرح

جب تک وہ میری فکر کی روحِ رواں نہ تھا
مَیں خوش بیاں ضرور تھا، جادو بیاں نہ تھا

جلتا رہا ہماری فقیرانہ شان سے
ہم پر امیرِ شہر کبھی مہرباں نہ تھا

تیور بدل گئے جو اُسے مَیں نے چھُو لیا
اِتنا تو وہ حَسین، مَیں ایسا جواں نہ تھا

مُجھ سے گئے دِنوں کا وہ مانگے گا سب حساب
پچیّس سال بعد مِلے گا، گُماں نہ تھا

تپ کر شدید دھوپ میں کُندن ہوئے ہیں ہم
اچھّا ہُوا کہ سر پہ کوئی سائباں نہ تھا

(چُٹکی بھر غزل)

زندگی
بیکسی

مصلحت
دوستی

قُربتیں
تشنگی

سانحہ
عاشقی

بندشیں
مُنصفی

رائیگاں
آگہی

عجب دو بھائیوں کا پیار بھی ہے
کہ آنگن میں کھڑی دیوار بھی ہے

پھٹے کپڑوں پہ مت جاؤ ہمارے
یہ دیکھو سر پہ اک دستار بھی ہے

پتہ چلتا ہے اخبارات پڑھ کر
ہمارے مُلک میں سرکار بھی ہے

لچک جائے تو شاخِ گُل ہے، ورنہ
وہ سر سے پا تلک تلوار بھی ہے

کمائی آج ہفتے بھر کی ہو گی
تری یادیں بھی ہیں، اتوار بھی ہے

حفاظت یُوں تو واجب ہے اَنا کی
مگر اس عہد میں دشوار بھی ہے

بچھاتے اوڑھتے ہیں عقل و دانش
ہمیں لیکن جنوں سے پیار بھی ہے

ندیمؔ اک خادمِ قانون ہو کر
زبانِ میرؔ کا فنکار بھی ہے

○

وہ کبھی قتل ہو نہ پایا ہے
زیرِ خنجر جو مسکرایا ہے

دل میں اُترو جو تم مسیحا ہو
ہم نے کب زخمِ دل دِکھایا ہے

یہ نہیں میری منزلِ مقصود
یہ ترے گیسوؤں کا سایہ ہے

ترکِ اُلفت کا عزم خطرے میں
آج پھر خط کسی کا آیا ہے

کرب جھیلے ہے تشنگی کا زمیں
اور سمندر پہ ابر چھایا ہے

○

بھاگتے لمحوں کو بڑھ کر قید کر جاتی ہے رات
اُن کی آمد کا گماں ہو تو ٹھہر جاتی ہے رات

ہاتھ میں آ کر کبوتر جیسے کوئی چھوٹ جائے
یُوں تری یادوں کے عالم میں گزر جاتی ہے رات

صُبح تک جذبوں سے میرے کھیلتی ہے، پھر مُجھے
دن کے ہاتھوں میں تھما کر اپنے گھر جاتی ہے رات

جلتے جلتے بُجھ سی جاتی ہے جو شمعِ انتظار
زہر کی صورت رگ و پے میں بکھر جاتی ہے رات

اُس نے یہ کہہ کر مرے ہونٹوں پہ رکھ دیں انگلیاں
''قصۂ غم کیجیئے اب مختصر، جاتی ہے رات''

دیر تک چھائی ہوئی رہتی ہے احساسات پر
پھر سِمٹ کر اُن کی آنکھوں میں اُتر جاتی ہے رات

○

(بھوپال گیس ٹریجڈی)

کتنی کم بخت ہیں نئی نسلیں
سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتی ہیں

سانحہ اس صدی کا مت پوچھو
اب ہوائیں بھی قتل کرتی ہیں

(۱۹۹۶ء میں بالا پور سے اکولہ منتقلی کے بعد)

○

گاؤں جب چھوڑ چکے اپنا تو جانا ہم نے
کس اذیّت کو رگِ جاں کی چُبھن کہتے ہیں

لاکھ زخموں پہ بھی بھاری ہے، ہُوا اب معلوم
ہائے وہ زخم جِسے ''ترکِ وطن'' کہتے ہیں

''میرے مکاں میں چھوڑ گیا''.................!!

(۱۹؍مارچ ۱۹۹۶ء کی شب پیٹھن، ضلع اورنگ آباد میں میری سرکاری رہائش گاہ پر جناب انجم رومانی، جناب پرواز اعظمی اور جناب شمس اعجاز میرے مہمان تھے۔ صبح ہوئی تو دس بجے جناب پرواز اعظمی پر اچانک دل کا دورہ پڑا اور دوپہر ایک بجے وہ اورنگ آباد کے ایک ہارٹ کلینک میں چل بسے۔)

ہوا میں یُوں وہ اچانک بکھر گیا کیسے
جو زندگی کی علامت تھا، مر گیا کیسے
ندیمؔ شمسؔ کا، انجمؔ کا یارِ دیرینہ
نہ جانے اندھے کنوئیں میں اُتر گیا کیسے
بجا کہ نام تھا پروازؔ اعظمی اُس کا
پہ اِس ادا سے وہ پرواز کر گیا کیسے

وہ میرے گھر مرا مہمان بن کے آیا تھا
پہ مجھ سے رشتۂ اخلاص پل میں توڑ گیا
جو رات دیر تلک دے رہا تھا درسِ حیات
ہوئی جو صبح تو منہ کس لئے وہ موڑ گیا؟
عجیب شخص تھا آنسو وہ دے گیا سب کو
اور اپنے قہقہے میرے مکاں میں چھوڑ گیا

ہم بھٹکتے ہیں یہاں خانہ خرابوں کی طرح
تم اَنا بیچ کے جیتے ہو نوابوں کی طرح

زخم دے کر ہمیں وہ خوش تو بہت ہے لیکن
ہم نے زخموں کو بھی چاہا ہے گلابوں کی طرح

مَیں ترے لطف و کرم کا نہیں طالب لیکن
زندگی ٹوٹ نہ یوں مجھ پہ عذابوں کی طرح

معتبر اتنی زیادہ نہیں توبہ میری
تم نہ چھلکا کرو ہر وقت شرابوں کی طرح

اُس کی آنکھیں کھُلے اوراق کی صورت ہیں ندیمؔ
لاکھ وہ ہم سے ملے بند کتابوں کی طرح

کردار پر کسی کے نہ کیچڑ اُچھالیئے
بہتر ہے اپنی دُکھتی ہوئی رگ سنبھالیئے

فرقت کا درد پھر مرے دامن میں ڈالیئے
پھر کوئی روٹھ جانے کی صورت نکالیئے

یہ مشورہ ہے، جشنِ چراغاں سے پیشتر
ذہنوں میں جو بسے ہیں اندھیرے، اُجالیئے

ہوتے امیرِ شہرِ ادب ہم، یہ یُوں ہُوا
اِس نوکری نے فکر کے موتی چُرالیئے

جینا حرام کر گئی چاہت ندیم جی
کس نے کہا تھا آپ سے، یہ روگ پالیئے

مجُھ کو اے شہرِ طرب غم کے نگر جانے دے
دل کہاں لگتا ہے پردیس میں، گھر جانے دے

جَل اُٹھے ہیں تو جلے رہنے دے یادوں کے چراغ
ایک عالم کو گزرنا ہے گزر جانے دے

دل کی خواہش ہے کہ محفوظ رہے زخم ترا
وقت کہتا ہے کہ یہ زخم بھی بھر جانے دے

پھر مرا غم ترے چہرے کو ضیاء بخشے گا
رُخ پہ آنکھوں کا یہ کاجل تو بکھر جانے دے

وسعتِ فکر ہے کم کم ترے شعروں میں ندیم
تجھ پہ ہے گوشہ نشینی کا اثر، جانے دے

چھیڑتی کیوں ہیں یہ خاموش گپھائیں مجھ کو
کون دیتا ہے پہاڑوں میں صدائیں مجھ کو؟

چشمِ پُرنم کیلئے کب ہے نیا یہ منظر
کیا لُبھائیں گی یہ گھنگھور گھٹائیں مجھ کو

خود ہی اب میری اسیری میں چلا آیا ہے
تھک گیا تھا کوئی دے دے کے سزائیں مجھ کو

تُخم ہُوں، لعل و جواہر مجھے درکار نہیں
بھیگتی سانولی مٹّی میں اُگائیں مجھ کو

مجھ سا ناچیز کہاں اور کہاں یہ اعزاز
آگئیں راس بزرگوں کی دعائیں مجھ کو

مَیں دِیا ہوں، مجھے جلنا ہے اندھیروں میں ندیمؔ
میرے احباب بصد شوق جلائیں مجھ کو

اپنی اوقات سے کمبخت گُزرنا چاہے
میرا غم آپ کی پلکوں پہ ٹھہرنا چاہے

حوصلہ میرا اُڑانیں نئی بھرنا چاہے
اور زمانہ ہے کہ پر میرے کترنا چاہے

حال مجھ سے یہ کہے مجھ میں سما جا بڑھ کر
اور ماضی مری رگ رگ میں اُترنا چاہے

زندگی مجھ سے چراتی ہے کچھ ایسے دامن
جیسے مہوش کوئی وعدے سے مکرنا چاہے

مَیں یہ چاہوں کہ نہ وہ مجھ میں نمایاں ہو کہیں
درد بن کر جو مرے رُخ پہ بکھرنا چاہے

ہے گھنی چھاؤں جل رہا ہُوں مَیں
کیسے آنگن میں پَل رہا ہُوں میں؟

ہے تری رہگزر پہ بھیڑ بہت
اپنا رستہ بدل رہا ہُوں مَیں

ہند ہُوں، بھوک مجھ پہ حاوی ہے
یُوں تو سونا اُگل رہا ہُوں مَیں

قابلِ رشک ہُوں، اُن آنکھوں میں
اشک بن کر مچل رہا ہُوں مَیں

مَیں جنوں ہُوں نہ مُجھ سے آنکھ مِلا
نظمِ عالم بدل رہا ہُوں مَیں

کب سُلجھ پائے اہلِ دانش سے؟
جن مسائل کا حل رہا ہُوں میں

مَیں دیکھوں اُس شوخ کے تیور، وہ میرے دَم خم یارو
دونوں مِل کر جھیل رہے ہیں رنجش کا موسم یارو

کون سُنے گا، سناٹے میں شیش محل کی اُس جانب
اک نسوانی چیخ اُبھر کر توڑ رہی ہے دَم یارو

ناگن بن کر ڈس لیتی ہیں ماضی کی کچھ تصویریں
رہنے دو کیوں تڑپاتے ہو، مت کھولو البم یارو

شعر کہیں کیا اُن زلفوں پر، اُن ہونٹوں، اُن آنکھوں پر
جلتے شہروں کی حالت بھی دیکھ رہے ہیں ہم یارو

اَمرت کہہ کر زہر دیا کرتی ہے زندہ لوگوں کو
مُردہ جسموں پر کرتی ہے یہ دُنیا ماتم یارو

(جون ۱۹۹۲ء میں میرا تبادلہ احمد نگر ضلع کے ایک چھوٹے سے دُور افتادہ دیہات ''شیوگاؤں'' ہُوا تھا۔ جہاں مَیں نے عمرِ عزیز کے دو سال گزارے۔)

کینوس پر مری قسمت کے' یہ اُبھرا کیا ہے؟
گاؤں ہے کوئی کہ ہے دشتِ تمنّا' کیا ہے؟

کوئی محفل ہے نہ اُردو کا یہاں نام و نشاں
طبعِ شاعر ترا اب مُجھ سے تقاضا کیا ہے

دیکھتے ہیں مِرا ہنستا ہُوا چہرہ سب لوگ
کوئی پڑھتا نہیں اس چہرے پہ لکھّا کیا ہے

عدلیہ باندھ کے رکھنا ہے کہاں تک مُجھ کو
تیرا اس فطرتِ آزاد سے رشتہ کیا ہے ؟

شخصیت کی ہمہ گیری تُجھے لے جاؤں کہاں
ماسِوا گوشہ نشینی یہاں رکھّا کیا ہے

سات پُشتوں میں یہ منصب تجھے حاصل ہے ندیمؔ
اِس کے آگے ترے جذبات کی دُنیا کیا ہے

وہ سنگ دل ہے' یہ آنکھوں میں اشک بھر دے گی
مری غزل کسی پتھّر کو موم کر دے گی

خبر کرے کوئی کم فہم پہرہ داروں کو
یہ قید و بند ہی جذبوں کو بال و پر دے گی

ہزار منزلیں آسان تجھ پہ کر دے گا
وہ حوصلہ جو تجھے راہِ پر خطر دے گا

نہ برگِ فکر یہ ڈھونڈ اب روایتوں کے گلاب
''خمارؔ'' ہاتھ لگیں گے نہ یہ ''جگرؔ'' دے گی

سماعتیں شبِ غم میں خدا رکھے محفوظ
سُنا ہے دستکیں در پر مرے سحر دے گی

کسے خبر تھی کہ برسیں گے پھول یُوں مجھ پر
متاعِ علم و ہنر زخم زخم کر دے گی !!

کب ہے ممکن تیر سے، تلوار سے
جیتئے دل نرمیٔ گفتار سے

باریابی کو کھڑی ہیں منزلیں
تھک کے بیٹھا ہُوں تری دیوار سے

ہوٹلوں میں خونِ انساں کی پھوار
راستے بھی اب لگیں گلزار سے

شہر ہے محدود، وحشت بیکراں
''لادے اک جنگل مجھے بازار سے''

میری کشتی میں کئی سوراخ ہیں
مت صدا دے جھیل کے اُس پار سے

فیض ہے یہ تیری غزلوں کا ندیم
پیار اُن کو ہوگیا اخبار سے

اہلِ دانش یہاں کمیاب نظر آتے ہیں
کہیں رُستم کہیں سہراب نظر آتے ہیں

بوجھ کب تک غمِ جاناں کا اُٹھانا دل نے ؟
اب تو تھکتے ہوئے اعصاب نظر آتے ہیں

کیا فقط نام سے پہچان نہیں یاروں کی ؟
آگے پیچھے جو یہ القاب نظر آتے ہیں

بچ نکلنے کی کوئی راہ تو نکلے صاحب
جس طرف دیکھئے احباب نظر آتے ہیں

اپنے چہروں کے وہ داغوں سے پریشاں ہیں ندیم
ہاتھ میں جو لئے تیزاب نظر آتے ہیں

○

خزاں رسیدہ سا اب چاہتوں کا موسم ہے
جو پُر بہار ہے وہ رنجشوں کا موسم ہے

عیاں خرد کی ہے ہر سمت جلوہ آرائی
جدھر بھی دیکھئے بس وحشتوں کا موسم ہے

پھر آج وَا ہُوئیں ماضی کی کھڑکیاں مجھ پر
ہے دستکوں کی فضا، آہٹوں کا موسم ہے

کسی کی یاد کی بارش میں جل رہا ہے بدن
عجیب شئے مری تنہائیوں کا موسم ہے

ندیمؔ سر میں تو اُگنے لگی ہے اب چاندی
پہ آنکھ نم ہے، وہی رَتجگوں کا موسم ہے

واپسی

(چھوٹے بھائی ظفر حسین کے سولہ سال بعد متحدہ عرب امارات سے وطن لوٹنے پر ایک تاثر،
جون ۱۹۹۸ء)

○

ابر کا ایک آوارہ ٹکڑا
وسعتوں میں کہیں
آسمانوں کی جو کھو گیا تھا
گھر کے آنگن میں پھیلے درختوں کے سائے میں جو
دھوپ تپتی ہوئی بو گیا تھا

راستہ جس کا تکتے ہوئے
بوڑھی آنکھیں چھلکنے لگی تھیں
نا امیدی کے موسم جواں سال چہروں پہ چھانے لگے تھے
جس کی خاطر دُعا کیلئے
ہاتھ ننّھے فرشتے بھی اپنے اُٹھانے لگے تھے
ہاں وہی ابر کا گمشدہ ایک ٹکڑا
مدّتوں بعد اک دن کسی سمت سے
یُوں اچانک
نمودار بامِ فلک پر ہُوا
کھُل کے برسا مرے گھر کے آنگن پہ یُوں
چیر کر سینۂ تیرگی
ہو اُجالوں کا جیسے ظہور
جیسے سورج نکل آئے برسائے نُور.......

رگ رگ میں پھیلتا ہی رہے بے کلی کا زہر
دشمن کو بھی مِلے نہ یہ دل کی لگی کا زہر

عرصے سے ایک کربِ مسلسل کا ہُوں شکار
مدّت سے پی رہا ہُوں تری دوستی کا زہر

شہرت ہماری پاک رہی خود ستائی سے
ہم پر چڑھا نہیں کبھی اِس مینڈکی کا زہر

اب اے شبِ فراق گزر بھی کسی طرح
لے لے نہ میری جان کہیں چاندنی کا زہر

پی کر حیاتِ جاوداں کتنوں نے پائی ہے
مشروبِ منفرد ہے ندیمؔ عاشقی کا زہر

تری آنکھوں سے جب چھلکائی اپنی داستاں ہم نے
کسی صحرا میں جیسے نہر سی کر دی رواں ہم نے

نمائش پتھروں کی ہر گلی کوچے میں جاری ہے
یہ کیسے شہر میں کھولی ہے شیشے کی دُکاں ہم نے ؟

ہمارا جذبِ صادق کھینچ لایا ہے تُجھے ہم تک
بچھائی کب ہے تیرے راستے پر کہکشاں ہم نے ؟

ہمیں کب چاٹ پائی ہے یہ دیمک ناصحِ ناداں
کبھی پالا نہیں اندیشۂ سود و زیاں ہم نے

ندیمؔ اب اُس جگہ بچھڑے ہوئے ملتے ہیں آ کر
اک عرصہ قبل اُس کا ساتھ چھوڑا تھا جہاں ہم نے

(ناگپور یونیورسٹی کے ایم۔اے فائنل (اردو ادب) کے نصاب میں شامل)

دھوپ سے گردشِ حالات کی گھبرا جائے
دل کوئی پھول نہیں ہے کہ جو مُرجھا جائے

اپنی تہذیب کو ہر رنگ میں دیکھا جائے
شیش محلوں میں کبھی شب گئے جھانکا جائے

چند قطروں سے بھی پانی کے ہو سرشار کوئی
اور آ کر لبِ دریا کوئی پیاسا جائے

بند ذہنوں سے ضروری ہے تعفّن کا نکاس
کھڑکیاں کھول کے کمروں کا اُجالا جائے

ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہیکہ سلیقے سے تراشا جائے

عقل کہتی ہے کہ چل دشتِ تمنّا سے پرے
دل کو ضد ہیکہ اِسی دشت میں بھٹکا جائے

ہائے رے ضبطِ محبّت کی یہ ثابت قدمی
مجھ سے کاغذ پہ بھی وہ نام نہ لکھّا جائے

چاندنی اپنی بھی چھت پر کبھی اُترے گی ندیم
یوں اندھیروں سے لپٹ کر تو نہ رویا جائے

اِتنا مائل تھا کہ پل پل کی خبر رکھتا تھا
وقت جب ہم پہ عنایت کی نظر رکھتا تھا

یاد کر، ذہن پہ کچھ زور دے، پہچان مُجھے
تُو کبھی پیار سے اس کاندھے پہ سر رکھتا تھا

اب تری یاد میں رونے کا وہ ماحول نہیں
ورنہ مَیں بھی کبھی پلکوں پہ گہر رکھتا تھا

تاڑتا کیا کوئی اُس شخص کے کڑوے پن کو
شہد جیسا تھا وہ، لہجے میں ہُنر رکھتا تھا

وقت کی قدر نہ جانی، ہُوا ظُلمت کا شکار
وہ جو پہلو میں کبھی شمس و قمر رکھتا تھا

شام ڈھلتے ہی درِ دل پہ صدا دیتا ہے
دشتِ غربت میں ترا درد مزہ دیتا ہے

اپنے جلوے تو سمیٹے نہیں جاتے اُس سے
میری نظروں ہی پہ وہ قید لگا دیتا ہے

تاکہ تجدیدِ مراسم میں مزہ آجائے
رنجشوں کو کوئی دانستہ ہَوا دیتا ہے

مَیں کبھی تازہ گلابوں کی جو تعریف کروں
رُخ سے کچھ سوچ کے زُلفیں وہ ہٹا دیتا ہے

کِس کی سرگوشیاں سُنتا ہوں میں کمرے میں ندیم
کون چُپکے سے دِیا آکے بُجھا دیتا ہے

نظر میں اُن کی سمایا تو جیسے خار ہُوں مَیں
زمانے بھر کی نظر میں گناہ گار ہُوں مَیں

ادا نہ ہو سکا' مدّت ہوئی اُدھار ہُوں مَیں
کسی حَسین کی دُنیائے انتظار ہُوں مَیں

یہی وہ عیب ہے جس نے ڈبو دیا مجھ کو
کہ ایک پیکرِ اخلاص و انکسار ہُوں مَیں

فصیلِ درد پہ چسپاں ہوں اک زمانے سے
یہ اور بات' مسرّت کا اشتہار ہُوں مَیں

ہُوں عدلیہ میں' پہ فکرِ سُخن بھی جاری ہے
ندیم تنگِ ادب ہوں پہ باوقار ہُوں مَیں

غم میں اوروں کے یہ رونے کی گھڑی ہے صاحب
موتیوں کی ہے، جو آنکھوں میں لڑی ہے صاحب

ہم نے اک عمر گزاری ہے وہاں ہنس ہنس کر
موت ہر لحہ جہاں سر پہ کھڑی ہے صاحب

کوئی دستک سی درِ دل پہ دیا کرتا ہے
میرے پیروں میں تو زنجیر پڑی ہے صاحب

کافروں کو بھی مسلمان بنا دیتی ہے
ہائے کیا چیز مصیبت کی گھڑی ہے صاحب

جس پہ پڑ جائے، دِکھا دیتی ہے دن میں تارے
عشق کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی ہے صاحب

طبعِ خوددار نے جھکنا نہیں سیکھا، ورنہ
میری منزل مرے قدموں میں پڑی ہے صاحب

جھوم اُٹھے ہیں غم و آلام تیرے شہر میں
ہنس پڑی ہے گردشِ ایام تیرے شہر میں

میرے دل کی دھڑکنوں کی تیز رفتاری سے پوچھ
کیسے گزری ہے سُہانی شام تیرے شہر میں

آنسوؤں کے پھول لایا ہوں چڑھانے کیلئے
دفن ہے اک حسرتِ ناکام تیرے شہر میں

حُسن والوں کو تو ہیں اٹھکھیلیاں یُوں بھی معاف
عشق ٹھہرا موردِ الزام تیرے شہر میں

جھیل کے پہلو میں ہے آباد، جھرنوں کے قریب
ہم مگر پھرتے ہیں تشنہ کام تیرے شہر میں

غم بن کے اُن کی آنکھ سے چھلکا نہیں ہُوں مَیں
رستے میں ہُوں، مقام پہ پہنچا نہیں ہُوں مَیں

اپنی شکست ماننے والا نہیں ہُوں مَیں
ٹوٹا تو ہُوں ضرور، پہ بکھرا نہیں ہُوں مَیں

اس حوصلے کی داد کوئی دے نہ دے مگر
مدّت سے اُس کی یاد میں رویا نہیں ہُوں مَیں

مجھ کو پلک پلک ہے اُجالوں کی جستجو
تاریکیوں میں قید ہُوں، اندھا نہیں ہُوں مَیں

چھوٹا سا اِک دِیا ہُوں مگر اپنی شان کا
ہر بزمِ خاص و عام میں جلتا نہیں ہُوں مَیں

اچھوں کو جب قریب سے دیکھا تو اے ندیمؔ
اچھا لگا کہ اتنا بھی اچھا نہیں ہُوں مَیں

رہِ وفا میں گھنے پیپلوں کی بات نہ کر
کڑی ہے دھوپ، یہاں راحتوں کی بات نہ کر

جنوں کی سر پہ سواری کے دن تمام ہوئے
خرد کا دَور ہے، اب مقتلوں کی بات نہ کر

اک عمر بعد مِلا ہے تو مُسکرا کے مِل
جو خشک ہو چکے اُن آنسوؤں کی بات نہ کر

سمندروں پہ برسنا ہے بادلوں کا شعار
تُو اپنے تپتے ہُوئے آنگنوں کی بات نہ کر

بکھرتے ٹوٹتے شہروں کے دُکھ بہت ہیں میاں
جو دِل پہ گزرے ہیں اُن حادثوں کی بات نہ کر

نہ مُڑ کے دیکھ' جواں عزم ساتھ رکھ اپنے
بچھڑ گیا ہے تو پھر قافلوں کی بات نہ کر

مِلے تو خشک فضاؤں سے فیض کر حاصل
جو تھم کے رہ گئیں اُن بارشوں کی بات نہ کر

وہ قُربتیں' وہ خُنک چاندنی' وہ ویرانے
مرے ندیم گئے موسموں کی بات نہ کر

○

ابھی مہلت کہاں ہم کو کتابوں سے عدالت سے؟
سنواریں گے کسی کے گیسوئے خمدار فرصت سے

پریشاں ہوگیا ہے دل خوشی بے انتہا پا کر
کہیں پھر ہو نہ جائے سامنا تازہ مصیبت سے

چلو اچھّا ہُوا مجھ کو محبّت یوں تو راس آئی
کہ ہر غم مجھ پہ ہلکا ہے اِس اِک غم کی فضیلت سے

اداکاری کرو' شطرنج کھیلو' راس آئے گی
سیاست کو تعلّق اب کہاں علمی لیاقت سے

جو مَیں عزم جواں لیکر کبھی موجوں سے ٹکرایا
تو دیکھا میری کشتی کو کناروں نے بھی حسرت سے

ایک عالم ہے ہزاروں میں یہ عالم جاناں
تیرے چہرے پہ مرے درد کا موسم جاناں

کھِلکھِلا اُٹھتے ہیں احساس کے سوکھے ہوئے پھول
یُوں ٹپکتی ہے تری یاد کی شبنم جاناں

پھاڑ کر پھینک چُکا ہوں مَیں وہ کچھ تصویریں
مانگ مت مُجھ سے گئے وقت کا البم جاناں

اب ترا سُرمئی آنچل جو نہیں ہے حاصل
میری آنکھوں سے بھی چھلکے نہ کوئی غم جاناں

تیرے پیروں میں کہاں دشتِ وفا کے کانٹے
تُو کہ اس راہ سے گزرا ہے بہت کم جاناں

"التجا"

(ماہِ رمضان المبارک نومبر ۲۰۰۳ء میں کہی گئی۔)

قلم کو میرے نیا اہتمام دے اللہ
خیال و فکر کو اونچا مقام دے اللہ
دل و نگاہ کو پاکیزگی عطا کر دے
زباں کو شوقِ درود و سلام دے اللہ
طلب کی راہ میں کچھ اور دے نہ دے مجھ کو
یہ اِک تمیزِ حلال و حرام دے اللہ
مرے[1] بھی نام لکھی جائے صبح مکّے کی
کبھی مجھے بھی مدینے کی شام دے اللہ
نہ تیرے در کے سِوا میرا سر کہیں خم ہو
خودی کا اپنی مجھے احترام دے اللہ
گدازِ قلب جو حاصل ہے ماہِ رمضاں میں
بقا نصیب کر اِس کو دوام دے اللہ

[1] اللہ نے نومبر ۲۰۱۱ء میں یہ سعادت نصیب فرمائی۔

"اعتراف"

وہ احساسات' نازک اب کہاں ہیں
کدھر جذبات کا لشکر گیا ہے ؟
مری پرواز کس نے چھین لی ہے
کتر کر کون بال و پر گیا ہے
اُٹھا کر کون فکر و فن کے موتی
یہ دامن بے حسی سے بھر گیا ہے
مَیں کِس کے فیض سے زندہ تھا اب تک
یہ کون اب بے وفائی کر گیا ہے
بہت سوچا تو کل شب مَیں نے جانا
[1] جو اک شاعر تھا مجھ میں' مَر گیا ہے

[1] ایک وقت ایسا بھی آیا تھا۔

O

زُلفوں کی گھٹاؤں میں تمازت بھی بہت ہے
راس آئے تو اس چھاؤں میں راحت بھی بہت ہے

در پر نہ کوئی آئے نہ پوچھے ہے کوئی حال
مُنصف کی مگر شہر میں عزّت بھی بہت ہے

ہم گوشہ نشینی میں بھی خوش ہیں' یہ الگ بات
یاروں کی مگر اس میں سیاست بھی بہت ہے

منبر سے تو دُنیا کو وہ کوسے ہے مسلسل
اِس شئے کی مگر شیخ کو چاہت بھی بہت ہے

ہے خوب بہت فلسفۂ عشق و محبّت
مصروف مگر ہم' ابھی عجلت بھی بہت ہے

دن[1] گزر جائیں گے سرکار' کوئی بات نہیں
زخم بھر جائیں گے سرکار' کوئی بات نہیں

شہر جلتے ہیں تو جل جائیں بلا سے اپنی
چاند پر جائیں گے سرکار' کوئی بات نہیں

آپ کہتے ہیں تو زُلفوں کے خُنک سائے میں
ہم ٹھہر جائیں گے سرکار' کوئی بات نہیں

بند کمرے میں اَنا کا نہ کریں گے سودا
گُھٹ کے مر جائیں گے سرکار' کوئی بات نہیں

آپ کے درد کی تکریم' ہمارا ذمّہ
ضبط کر جائیں گے سرکار' کوئی بات نہیں

[1] بخُدا یہ مطلع کہنے کے کچھ دنوں بعد کسی سے معلوم ہُوا کہ بالکل یہی مطلع عبدالحمید عدم مرحوم نے بھی کہا تھا۔ لیکن چونکہ میرا ضمیر صاف ہے' مَیں نے یہ مطلع اپنی غزل سے حذف نہیں کیا ہے۔
منظور ندیم

بعد میرے اُس گلی میں اور کیا رہ جائیگا ؟
اک دریچہ میرا رستہ دیکھتا رہ جائیگا

اس قدر ترکِ تعلّق کو نہ آساں جانیئے
آپ کے چہرے پہ میرا غم بچھا رہ جائیگا

آپ گر یونہی تکلّف ہم سے فرماتے رہے
عُمر کٹ جائے گی لیکن فاصلہ رہ جائیگا

مَیں تجھے گر چھوڑ بھی جاؤں تو "بالاپور" سُن
نام میرا اِن فصیلوں پر کھُدا رہ جائیگا

محکمہ گر ہاں کہے تیرا تو چھپوا لے ندیم
یہ اثاثہ فکر کا ورنہ پڑا رہ جائیگا

مِلنا نہ ہو ممکن تو رسائل میں پڑھا کر
مُجھ کو مری غزلوں میں ہی محسوس کِیا کر

اُٹھ جاتے ہیں تحریر سے پُرکیف حجابات
جذبات کی شدّت میں مجھے خط نہ لکھا کر

کرتا ہے کرم حالِ پریشاں پہ ہمارے
اُمّید کے دامن میں وہ پیوند لگا کر

خود ہی کوئی کٹ کر ترے پہلو میں گرے گا
تُو حوصلۂ ترکِ تمنّا تو ذرا کر

کمرے میں مرے دھوپ اُتر آئی ہے اور مَیں
بیٹھا ہُوں تری یاد کی قندیل جلا کر

لہلہاتا ہے ترا درد بہاروں کی طرح
''اشک پلکوں پہ چمکتے ہیں ستاروں کی طرح''

مجھ کو تسخیر نہ کر پائے کبھی نام و نمود
میرے دامن سے یہ لپٹے رہے خاروں کی طرح

غم زدہ، وقت کے مارے، یہ بظاہر شاداب
ہم بھی کشمیر کے خاموش نظاروں کی طرح

میرے اخلاص کا اب یہ بھی کہاں ہے حقدار
رنگ بدلے ہے زمانہ مرے یاروں کی طرح

ہار میں بھی یہ مزہ جیت کا لیتے ہیں ندیمؔ
کون خوش بخت میاں عشق کے ماروں کی طرح؟

○

اُجلی رہے رنگت ' یہ تمنّا بھی کرے ہے
گھر سے وہ مگر دھوپ میں نکلا بھی کرے ہے

اُس شوخ کو ہم کیسے کہیں دشمنِ جانی ؟
سانسوں میں گلابوں سا جو مہکا بھی کرے ہے

دفتر سے نہ مُجھ کو کبھی مِل پائے جو رُخصت
نازک سا کوئی دل کہیں ٹوٹا بھی کرے ہے

کرنے کو تو کر بیٹھا ہے وہ ترکِ تعلّق
کھڑکی سے مُجھے جھانک کے دیکھا بھی کرے ہے

پھولوں کو جو چاہت سے چھُوا کرتا ہے منظورؔ
پتھّر کو سلیقے سے تراشا بھی کرے ہے

''عید اور آر۔ڈی۔ایکس''

(کشمیر کے دہشت گردوں کے نام........دسمبر ۲۰۰۰ء میں)

○

ایک مدّت ہوئی
ڈل جھیل کے جلووں پہ اُداسی ہے محیط
ایک عرصہ ہُوا
بادام کی شاخوں سے ٹپکتا ہے لہو
برف پگھلے
تو یہ لگتا ہیکہ روتا ہے پہاڑوں کا وقار
عالمِ خوف
محبّت کی گزرگاہوں میں
شہرِ گُل میں نہیں خوشبو کیلئے گنجائش !!
ہر طرف پھیلی ہے بارود کی بُو راہوں میں
نذرِ جاناں مجھے کرنی ہے
مگر برسوں سے
''چشمِ شاہی'' کی مرے پاس کوئی شام نہیں
شرم آتی ہے
جو اُس شُوخ سے مَیں کہتا ہوں
اپنی تقدیر میں گُلمرگ و پہلگام نہیں

سہمے سہمے یہ نظارے، یہ شکارے، یہ چناروں کی قطاریں کب تک
آگ اور خون میں لپٹی یہ بہاریں کب تک؟
ہر طرف
خون کی ندیاں تو بہا دیں تُم نے
پارلیمنٹ کے حسّاس احاطے ہی میں کیا
گولیاں لال قلعے میں بھی چلا دیں تُم نے
یوں تشدّد سے تو تکمیل مقاصد نہیں ہونے والی
خیر کا بیج یہ وحشت نہیں بونے والی
اس لئے وادیٔ کشمیر کے دہشت گردو
قوم و ملّت کے تعلّق سے بھی اب غور کرو
روزی روٹی کا یہ فقدان بھلا کتنے دن
باپ بچّوں سے پشیمان بھلا کتنے دن؟
آر۔ڈی۔اِکس کے جتنے بھی ذخیرے ہیں اُنھیں پھر سے وہیں لے جاؤ
پار......اُس پار ہمالہ کے
کہیں چھوڑ آؤ
وہ جو جائز نہیں، رشتے وہ سبھی توڑ آؤ
جنگ بندی ہی سے حل ہونگے تمھارے بھی ہمارے بھی مسائل سارے
اسی اقدام سے طے ہونگے مراحل سارے
دوستی وقت کی اک اہم ضرورت جانو
خون کی قدر کرو، خون کی قیمت جانو

کڑی ہے دھوپ، سکوں سائبان میں بھی نہیں
ذرا سا ابر کہیں آسمان میں بھی نہیں

مِلا جو گاؤں کے پیڑوں تلے بشکلِ خلوص
وہ شہد شہر کی اعلیٰ دُکان میں بھی نہیں

مَیں جس کی نیم کشی سے سُرور لے پاؤں
وہ ایک تیر تمھاری کمان میں بھی نہیں

ہے جانے کس طرح بے روزگار برسوں سے
وہ ایک شخص جو ہندوستان میں بھی نہیں

ہمیں بلندی جو بخشی ہے خاکساری نے
امیرِ شہر کی اونچی اُڑان میں بھی نہیں

پھٹی پُرانی ہیں کیوں ٹوپیاں نہ پوچھو ہو
ہم اہلِ فکر کی حالت میاں نہ پوچھو ہو

بکھر رہی ہے مرے گھر میں روشنی اُس کی
بُجھا رہا ہے کوئی بتّیاں ' نہ پوچھو ہو

اُتر سکا نہ مسیحا کبھی کوئی دل میں
ہمارے زخم کی گہرائیاں نہ پوچھو ہو

بچھے پڑے ہیں مری رہگذر پہ ماہ و نجوم
انا کھڑی ہے مگر درمیاں نہ پوچھو ہو

مُنافقوں میں کٹی جا رہی ہے عمرِ عزیز
ہمارے رزق کی مجبوریاں نہ پوچھو ہو

چھایا تھا یُوں تو ابر ہماری دعاؤں سے
اک بوند بھی ملی نہ برستی گھٹاؤں سے

برفیلی وادیوں میں جب آتا ہے کوئی یاد
اک گیت سا اُبھرتا ہے دھندلی فضاؤں سے

وہ شخص شہر میں مجھے پہچانتا نہیں
مَیں جس کا حال پوچھنے آیا ہوں گاؤں سے

معصوم کوئی قید ہو الزام قتل میں
بُو خون کی جب آئے ہے اُجلی قباؤں سے

شہرت کا آسماں تو نہیں دسترس سے دور
لپٹی پہ اک اَنا کی ہے زنجیر پاؤں سے

آلودۂ مسائلِ دنیا یہ جھیل ہے
میری غزل میں کب کوئی عکسِ جمیل ہے

کیسے سُنائیں ترکِ تعلّق کا فیصلہ؟
کمبخت اپنا دِل ہی کسی کا وکیل ہے

مجھ ہی کو اپنے آپ پہ قابو نہیں رہا
یا اُن کے التفات کی مدّت قلیل ہے؟

عُجلت میں ہُوں، ابھی نہ سُنا پاؤں گا تُجھے
مَیں نے جو نظم تجھ پہ لکھی ہے، طویل ہے

ہمدردیوں کی بھیک نہیں مانگتا ندیمؔ
اس ضِمن میں یہ شخص بڑا خود کفیل ہے

کر کے زیر و زبر بارشیں
ہیں شریکِ سفر بارشیں

خشک آنکھوں میں اُترا تھا کون
کل ہوئیں رات بھر بارشیں

شدّتِ دردِ فُرقت نہ پوچھ
ہیں پسینے میں تر بارشیں

اُڑ گیا اُس کو لے کر جہاز
رہ گئیں طاق پر بارشیں

روٹھ جانے کے یہ دن نہیں
اب کے ہیں مختصر بارشیں

آئی ہیں چھت سے ہو کر ندیمؔ
جھومتی اپنے گھر بارشیں

ہے ہم سے خفا گردشِ ایّام ابھی تک
ہونٹوں پہ لرزتا ہے ترا نام ابھی تک

ویران کھنڈر میں کہیں آہٹ سی جو سُن لے
دل چونک سا اُٹھتا ہے سرِ شام ابھی تک

تا عمر ستم میں وہ سلیقہ رہا شامل
سر اُن کے نہ آیا کوئی الزام ابھی تک

رُخ موڑ گئے جانبِ منزل جو ہمارا
ہیں یاد وہ بہکے ہوئے دو گام ابھی تک

وہ نیچی نظر عشق میں اس درجہ ہے محتاط
لیوے ہے نہ دیوے کوئی پیغام ابھی تک

فکر کا مرکز کبھی تیرا حسیں چہرہ بھی تھا
بھول بیٹھا ہُوں کہ مَیں نے تجھ پہ کچھ لکھا بھی تھا

اس دسمبر میں تو دشمن بن گئی ہے جان کی
چاندنی سے سرد راتوں میں کبھی رشتہ بھی تھا

آج جس دامن کے اُجلے پن پہ ہے سب کی نظر
کیا ہُوا اُس پر ہمارے خون کا دھبّا بھی تھا؟

اُس[1] سُخن کی بزم میں ہم کیا جلاتے شمعِ فکر
چونچ میں سورج لئے جس بزم میں مُرغا بھی تھا

اپنے ہاتھوں مجھ سے سب شیریں مراسم توڑ کر
رنجشوں کے تلخ موسم میں کوئی روتا بھی تھا

سلوٹیں بستر کی اُس کے کر رہی تھیں انکشاف
یاد میں میری گذشتہ شب کوئی ٹوٹا بھی تھا

میری غزلوں سے بظاہر بے تعلّق تھا مگر
چوری چوری وہ رسائل میں مجھے پڑھتا بھی تھا

جانے کس عالم میں اُس نے خط لکھا ہو اے ندیمؔ
ایسا لگتا ہے کہ یہ کاغذ کبھی بھیگا بھی تھا

[1] محترم ندا فاضلی سے معذرت کے ساتھ

(ایم۔اے فائنل اردو ادب' ناگپور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل)

نکھارتی رہی یلغارِ سنگ کیا کرتے
ہم اپنا حلقۂ احباب تنگ کیا کرتے

نہ تیتروں نہ بٹیروں سے ہم اُلجھ پائے
تھے اپنے آپ سے مصروفِ جنگ کیا کرتے

یہ دَور دے گیا تمغات چاپلوسوں کو
ہم ایسے دشتِ اَنا کے ملنگ' کیا کرتے

اُسے تھا شوق بہت آسمان چھونے کا
یہ کٹ گئی تھی ہماری پتنگ' کیا کرتے

مزاج پایا تھا گھُل مِل کے سب میں رہنے کا
جُدا تھا سب سے مگر اپنا رنگ کیا کرتے

اک عمر بعد ہُوا وقت مہرباں تو ندیمؔ
نہ آرزو تھی' نہ دل میں اُمنگ کیا کرتے

مَیں یُوں سُرور پا رہا ہُوں مسئلوں کے درمیاں
کہ جیسے گِھر کے خوش ہو کوئی مہ وشوں کے درمیاں

خرد تمام عمر جن پہ دو قدم نہ چل سکے
وہ راستے بھی طے ہوئے ہیں وحشتوں کے درمیاں

مَیں زندگی ہی زندگی ہُوں سر سے پا تلک مگر
نصیب لے کے آ گیا ہے مقبروں کے درمیاں

یہ کس کی یاد نے مقدّموں میں بھر دیا ہے رنگ
یہ کون ہنس رہا ہے میری فائلوں کے درمیاں

مُجھے تلاشیئے کہ مَیں یہیں کہیں ہُوں دستیاب
جدیدیت کی بھیڑ میں روایتوں کے درمیاں

تم اپنی قیدِ بال و پر سے کیوں دُکھی ہوا ے ندیم
تمھارا فن نکھر رہا ہے بندشوں کے درمیاں

غم کسی کا کروٹیں لیتا ہے اکثر رات کو
جھیل میں جذبات کی گرتے ہیں کنکر رات کو

یاد کر، پہلو سے تیرے اُڑ کے اکثر رات کو
میری کھڑکی میں اُترتا تھا کبوتر رات کو

دن ڈھلے تک ڈھونڈیئے اچھی سی کوئی نوکری
اوڑھ کر سو جایئے وعدوں کی چادر رات کو

پہلے مائل، پھر مُجھے دو آتشہ محسوس ہو
فِکر کا اپنی بدن دیکھوں جو چھو کر رات کو

عمر گزری اُس بُتِ طنّاز سے بچھڑے ندیم
اب بھی کاندھے پر مگر لگتا ہے وہ سر رات کو!!

دور رہتی ہے کیوں اجنبی کی طرح
زندگی ہم سے مِل زندگی کی طرح

اس نئے شہر میں لُٹ نہ جائے کہیں
دِل کسی گاؤں کی منچلی کی طرح

ہر گھڑی سر پہ تلوار لٹکی ہوئی
نوکری کب کوئی منصفی کی طرح

عہدِ نَو ہے، نیا طرز اپنائیے
دُشمنی کیجیئے دوستی کی طرح

اُس کی یادیں منوّر ہیں دل میں ندیمؔ
چھت پہ پھیلی ہوئی چاندنی کی طرح

لاکھ تجدیدِ مراسم سے وہ کتراتا ہے
بوجھ کب ترکِ تعلّق کا اُٹھا پاتا ہے

دن میں رہتا ہے پَرے مُجھ سے تصوّر اُس کا
رات ہوتی ہے تو پہلو مِرا گرماتا ہے

ہے ترے شہر میں، یا جھیل تری آنکھوں میں
سوچتا ہوں پہ سمجھ میں یہ کہاں آتا ہے ؟

کیسے مانوں کہ تجھے باندھ کے رکھتا ہے کوئی
خوشبوؤں کو بھی کہیں قید کیا جاتا ہے

رنجشیں دانت میں انگلی لئے بیٹھی ہیں ندیمؔ
وہ چلا آیا ہے تنہائی کو مہکاتا ہے

ناز عہدے کے اُٹھانا کیا یہی ہے زندگی
خود سے بھی دامن چُرانا کیا یہی ہے زندگی ؟

سانس بھی کھُل کر نہیں لیتا کھُلے ماحول میں
مصلحت کے زخم کھانا کیا یہی ہے زندگی

بزمِ یاراں' چائے خانے' قہقہے' آوارگی
نعمتوں سے ہاتھ اُٹھانا کیا یہی ہے زندگی

سب کے اُجڑے گھر بسانا اپنے احکامات سے
اپنے گھر ہفتوں نہ جانا' کیا یہی ہے زندگی

منزلوں سے بے نیازانہ گزر جانا ندیم
ٹھوکریں در در کی کھانا' کیا یہی ہے زندگی

شہہ' گدا' سب برابر ترے شہر میں
عالمِ روزِ محشر ترے شہر میں

صرف دو گھونٹ کا مَیں طلب گار ہُوں
بہہ رہا ہے سمندر ترے شہر میں

جس کو درکار اہلِ وفا کی گلی
کیا ملے گا اُسے گھر ترے شہر میں

عمر بھر میرے زخموں میں خوشبو رہی
وہ جو برسے تھے پتھّر' ترے شہر میں

خواہشیں جاگتے جاگتے تھک گئیں
سو گیا ہے مقدّر ترے شہر میں

رُخسار و زُلف و لب میں گرفتار سا ہنوز
میرا قلم ادب کا گنہہ گار سا ہنوز

جذبوں کی دھوپ میں وہی شدّت ہے آج بھی
تیرا وجود سایۂ دیوار سا ہنوز

مہلت کچھ اور چاہیئے مجھ کو خیالِ یار
ٹیبل پہ فائلوں کا ہے انبار سا ہنوز

مدّت ہوئی چھُوا تھا اُسے مَیں نے پیار سے
وہ شوخ لگ رہا ہے طرحدار سا ہنوز

فرصت کے چند لمحے بھی اب جیب میں نہیں
دل مانگتا ہے دن کوئی اتوار سا ہنوز

چشمۂ فیض و رحمت..............!!

رات تاریک تھی
ہر طرف کفر کے اژدہے
زہر اپنا اُگلنے میں مصروف تھے
اور انسانیت
تھی جہالت کے اندھے کنوؤں میں اسیر
خون روتی تھی تہذیب آٹھوں پہر
نفرتوں کا دھواں سا فضاؤں میں تھا

کفر کی شب

اندھیرا جب حد سے سوا ہو گیا
اک عجب واقعہ ہو گیا
پَو پھٹی
پَو کے پھٹتے ہی اک روشنی کی کرن
جگمگا کر
جہالت کے اندھے کنوؤں میں اُترنے لگی
زہر نفرت کا تھا جن میں
اُن سینوں میں پیار بھرنے لگی
زُلف انسانیت کی سنورنے لگی
آفتاب
اک ہدایت کا روشن ہُوا
نور سے جس کے دونوں جہاں جگمگانے لگے
تا ابد جگمگاتے رہیں گے
آفتابِ ہدایت کو حاصل دوام
چشمۂ فیض و رحمت پہ لاکھوں سلام

(جب ہموطن دوست جناب شیخ مسعود ریلوے آفیسر کو دہلی میں ریلوے کے نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا)

جس نے اس مٹّی کو قومی سطح پر چمکا دیا
نام روشن کر دیا ہے جس نے ''بالاپور'' کا

جس نے اِن گلیوں سے دہلی جا کے عزّت پائی ہے
وہ یقیناً یار ہی ہوگا کوئی ''منظور'' کا

دل کی کتاب کھول کے دلبر کے سامنے
ہم رو رہے ہیں بیٹھ کے پتھر کے سامنے

جلوے نہ بانٹ، گھر کے دریچوں کو بند کر
میلہ لگا ہُوا ہے ترے گھر کے سامنے

ہم پھول ہیں بڑھائے جو چاہت سے کوئی ہاتھ
مانندِ تیغ بھی ہیں ستمگر کے سامنے

بے رنگ سا مِلا تھا مُجھے خاکۂ حیات
کچھ رنگ بھر رہا ہُوں تُجھے کر کے سامنے

اِک عمر کی ہے پیاس مگر کیا کریں ندیمؔ
دَم ٹوٹ سا گیا ہے سمندر کے سامنے

سوئے ارمان جگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
خواب پلکوں پہ سجاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

طبعِ نازک پہ کہیں آپ کی، گزرے نہ گراں
پھول زلفوں میں لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

سر ندامت سے جھُکا لیں نہ کہیں ماہ و نجوم
داغ اس دِل کے دِکھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

گھر کا آنگن ہے بزرگوں کی امانت بھائی
اس میں دیوار اُٹھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

اُن کو اِس دَور میں انصاف کا مِلنا ہے محال
جن کو زنجیر ہلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

وہ اپنے جور و ستم کا حساب کیا دے گا
''سلام تک نہیں لیتا' جواب کیا دے گا''

فلک پہ اُس کی اُڑانیں' زمیں سے ہم منسوب
سوائے دھوپ کے وہ آفتاب کیا دے گا

کمالِ دستِ سیاست ہے یہ جنوں' اِس کا
حساب آپ کو ''اجمل قصاب'' کیا دے گا؟

بس اِک چبھن کے سوا شانِ بے نیازی کی
امیرِ شہر کو خانہ خراب کیا دے گا

زمانہ آگ میں جلتا ہے اب حسد کی ندیم
محبتوں کا تری یہ جواب کیا دے گا

اب پیار بھرا لمس بھی ٹھوکر سا لگے ہے
مت پوچھ کہ ہر ہاتھ میں پتھر سا لگے ہے

جس شخص کا ہے پیاس کی شدّت سے بُرا حال
وہ شخص بظاہر تو سمندر سا لگے ہے

آوارہ کہاں ہے مری آوارہ نگاہی ؟
ہر پیکرِ دلکش ترے پیکر سا لگے ہے

سہمے ہوئے جذبات' لرزتے ہوئے ارماں
دل بھی کسی آسیب زدہ گھر سا لگے ہے

کچھ وقت سفر میں کبھی گزرا تھا ترے ساتھ
اب تک مجھے شانے پہ ترا سر سا لگے ہے

یہ نادانی نہیں کرنا، یہ پردہ مت اُٹھانا تُم
مری نظمیں تمھیں تک ہیں کسی کو مت سُنانا تُم

اثر مطلوب ہو تُم کو اگر اپنی دعاؤں میں
کبھی کھُل کر ہماری یاد میں آنسو بہانا تُم

پھر اُس کے بعد دینا مشورہ ترکِ تعلّق کا
جو میرے خط تمھارے پاس ہیں پہلے جلانا تُم

تمھیں باتیں محبّت کی اگر اتنی ہی پیاری ہیں
تو کچھ کچھ یاد رکھ لینا یہ کچھ کچھ بھول جانا تُم

بچھڑتے وقت یہ کہہ کر کسی نے جان لے لی تھی
''مرا کیا ہے کتابوں میں برابر دل لگانا تُم''

پتھّر کے دَور میں مری نازک خیالیاں
نشتر ہیں طنز کے، یہ جو بجتی ہیں تالیاں

چہرے جو داغ داغ بڑی ہستیوں کے ہیں
خطرے میں اِن دِنوں ہیں بہت خوش جمالیاں

آئے تھے روزگار کا غم لیکے گاؤں سے
ہر غم بھُلا رہی ہیں مگر شہر والیاں

سوچا، کہ دو ٹکے میں بھی ڈگری نہ بِک سکی
گل بیچ آؤں گا ترے کانوں کی بالیاں

پتّوں کا بوجھ اِن کو گوارہ نہیں ندیمؔ !!
اِس بے تکی بہار میں ننگی ہیں ڈالیاں

ربط یادوں سے تری ٹوٹ چلا ہو جیسے
چاند سا دُور کہیں ڈوب رہا ہو جیسے

کس شرافت سے اسے جھیل رہا ہوں میں بھی
زندگی میرے گناہوں کی سزا ہو جیسے

میری وحشت کو بھی حاصل ہے بیاباں لیکن
پاؤں میں اس کے کوئی زخم لگا ہو جیسے

عقل تو کر چکی تسخیر زمانے بھر کو
دل ابھی تک ترے آنچل سے بندھا ہو جیسے

بعد مدّت کے اچانک یہ ترا خط جاناں
جھیل میں پھر کوئی کنکر سا گرا ہو جیسے

ایسے ماحول میں زندہ ہے مری فکر ندیمؔ
آتشیں دھوپ میں اک پھول کِھلا ہو جیسے !!

سہمی ہوئی، حالات سے گھبرائی ہوئی سی
ہے دل میں تمنّا تری مُرجھائی ہوئی سی

یہ ہجر کی راتیں، یہ تری یادِ مسلسل
تپتے ہوئے صحرا پہ گھٹا چھائی ہوئی سی

کیوں ٹوٹ کے ملتی نہیں اے گردشِ دوراں
غیروں سا روّیہ ترا، کترائی ہوئی سی

اُف ٹھنڈی ہَوا میں یہ حرارت سی اچانک
اک شوخ کے چہرے پہ حیا آئی ہوئی سی

کیا باغ مجھے سبز دِکھائے گی یہ دُنیا ؟
لَوٹی ہے مرے در سے جو ٹھکرائی ہوئی سی

اُن کی آنکھوں میں بھر گئے شاید
میرے غم کام کر گئے شاید

میکدے میں ہے جشنِ استقبال
شیخ صاحب سُدھر گئے شاید

ایک عالم کی پُرسکوں ہے فضا
اُن کے گیسو سنور گئے شاید

کچھ تو اُن کا مزاج نازک تھا
ہم بھی حد سے گزر گئے شاید

ایک پژمردگی سی طاری ہے
''زخم اب دل کے بھر گئے شاید''

اُجالے بانٹ کے سب کو پگھل رہی ہے حیات
مثالِ شمع اندھیروں میں جل رہی ہے حیات

اُلجھ کے رہ گئی زُلفوں کے پیچ وخم میں کہیں
کہیں مزاجِ زمانہ بدل رہی ہے حیات

یہ لمحہ لمحہ اُداسی، یہ حسرتوں کا ہجوم
شبِ فراق کی مانند ڈھل رہی ہے حیات

ہُوا تھا ہم سے بھی ماضی میں سامنا اُس کا
ہمارے ساتھ بھی دو چار پل رہی ہے حیات

ابھی ہے وقت تو گیسو سنوار لے اِس کے
ندیمؔ ہاتھ سے ورنہ نکل رہی ہے حیات

کاش رُخ پر ترے پھر وہ عالم مِلے
میرے غم میں تری آنکھ پُرنم مِلے

احتیاط اُس کی فطرت میں شامل بہت
محفلوں میں کوئی ہم سے کم کم مِلے

یُوں قیامت کا آنا تو آساں نہ تھا
مدّتوں بعد اُن سے مگر ہم مِلے

چاہتیں جن پہ قربان اِک عمر کی
رنجشوں کے ہمیں ایسے موسم مِلے

فائلیں روز و شب چاٹتی ہیں دماغ
کیا ندیم اپنی غزلوں میں دم خم مِلے

جو ایک شخص مرے دل میں چھپ کے بیٹھا ہے
روایتوں کو بڑی بے بسی سے تکتا ہے

اُگا ہے وقت کی بے رحم دھوپ میں لیکن
ہماری فکر کا پودا ہرا بھرا سا ہے

خرد کو حوصلہ اتنا کہاں میّسر تھا
تمھارے غم کو مری وحشتوں نے پالا ہے

کھُدا ہُوا ہے درختوں پہ تیرا نام اب تک
یہ بوڑھا باغ مجھے آج بھی رُلاتا ہے

خلوص نام کا یہ اجنبی سا لفظ ندیم
کسی کتاب میں شاید نظر سے گزرا ہے

کیا سُنائیں ہم عشق کی روداد
بِن سویرے کی رات ہے صاحب

عمر درکار ہے بیاں کرنے
چند لمحوں کی بات ہے صاحب

سانسوں میں وہ پہلی سی حرارت نہیں باقی
پلکوں پہ وہ بھیگا ہُوا موسم بھی نہیں ہے

عرصے سے قیامت کوئی گزری نہیں دل پر
مدّت سے تری یاد کا عالم بھی نہیں ہے

کیوں عبث کھولتا رہتا ہے دریچے کوئی
ہم کو فرصت کہاں، جلووں کو سمیٹے کوئی

حق میں کم ظرف کے ہوتا ہے غمِ عشق عذاب
اور اس غم کو سلیقے سے جو برتے کوئی

اتنا محتاط کہ محفل میں تخاطب تو کُجا
نام سے اپنے مجھے خط بھی نہ لکھّے کوئی

مُجھ کو للچائے کسی ابر کے ٹکڑے کی طرح
میرے آنگن میں کبھی کھُل کے نہ برسے کوئی

اُس کی جانب ہی سے اظہارِ محبّت ہو ندیم
ڈائری کے تری، اشعار نہ پڑھ لے کوئی

○

بحرِ جذبات میں یُوں کوئی اُتارے مجھ کو
ڈوبنا چاہوں تو خود بڑھ کے اُبھارے مجھ کو

چاندنی، دھوپ سی لگتی ہے بچھڑ کر تجھ سے
راس آتے نہیں خوش رنگ نظارے مجھ کو

کب بھلا میری اَنا اِن کو گوارا کرتی
ایک مدّت سے ترستے ہیں سہارے مجھ کو

مَیں کہ نظریں بھی مِلانے سے ہُوں قاصر یارو
زندگی تھک گئی کر کر کے اشارے مجھ کو

مَیں زمیں کا ہُوں یہ احساس سدا ساتھ رہا
جیت پائے نہ کبھی چاند ستارے مجھ کو

○

نہ خانقاہوں کے سائے، نہ تاج و تخت مجھے
عطا ہُوا ہے بس اِک 'دھوپ کا درخت' مجھے

قدم قدم پہ ہے یاروں کو سیم و زر کی تلاش
دُعا بزرگوں کی اپنے سفر کا رَخت مجھے

خواص فیض اُٹھاتے ہیں روشنی سے مری
اور عام لوگ سمجھتے ہیں تیرہ بخت مجھے

وہ سنگ دِل ہے، مگر نرم ہے دمِ گفتار
مَیں نرم دل ہُوں پہ لہجہ مِلا کرخت مجھے

تمام عمر کی محنت پہ پھیر دے پانی
دِکھائے آنکھ جب اپنے جگر کا لخت مجھے

ہری بھری ہے بہت فصلِ فکر و فن میری
یہ اور بات زمینیں ملی ہیں سخت مجھے

لکھے وہ نام ہمارا کبھی ' مِٹائے کبھی
گھروندہ ریت پہ ساحل کی' گر بنائے کبھی

یہ کیا کہ اب بھی وہی رکھ رکھاؤ پہلا سا
تکلّفات کی دیوار وہ گرائے کبھی

وہ اِک حسین سی شئے زندگی ہی تھی شاید
مِلی تھی جو تری زُلفوں کے سائے سائے کبھی

کبھی تو خود ہی کرے کوئی مُنتشر مجھ کو
بکھر سا جاؤں تو بڑھ کر سمیٹ لائے کبھی

عجیب خواب ہے' اب تک ہے تشنۂ تعبیر
مَیں روٹھ بیٹھوں' وہ آ کر مجھے منائے کبھی

یُوں تو روایتوں کے ہیں قائل سدا سے ہم
ہاں' فیض بھی اُٹھاتے ہیں تازہ ہَوا سے ہم

جھوٹے مقدّموں میں ملوّث ہماری قوم
پہچانے جائیں خون میں ڈوبی قبا سے ہم

کیا جانے کب یہ کون سی آفت خرید لے
ڈرتے بہت ہیں اِن دِنوں اپنی اَنا سے ہم

دونوں کے درمیان بڑا تال میل ہے
کچھ وہ گناہ گار سا کچھ پارسا سے ہم

ہے جسم زخم زخم ' یہ اندر کی بات ہے
خوش حال جانے جاتے ہیں اُجلی رِدا سے ہم

غم سے بڑے تپاک سے ہوتی ہے گفتگو
مِلتے ہیں ہر کسی سے کہاں اس اِدا سے ہم

اک عمر جی کے تیغ کے سائے میں بے خطر
کس شان سے ہوئے ہیں جُدا عدلیہ سے ہم

جس شوخ کو منانے میں برسوں لگے ندیمؔ
مائل ہُوا ہے اب' تو ہیں کچھ کچھ خفا سے ہم

○

قلم کو اِن دِنوں فرصت مرے ذرا بھی نہیں
ستم تو یہ ہے ترے نام کچھ لِکھا بھی نہیں !

ہے قربتوں کا تسلسل کچھ اس قدر بے کیف
دِلوں میں قُرب کا احساس جاگتا بھی نہیں

ترے نقوش بھی دھندلا گئے ہیں وقت کے ساتھ
مری نظر کا وہ پہلا سا حوصلہ بھی نہیں

اُبھر سا آیا ہے ہر لفظ اُس کے چہرے پر
اگرچہ اُس نے مِرا خط ابھی پڑھا بھی نہیں

تمام حُسن مسائل کے رُخ پہ بکھرا ہے
حَسین اب تری یادوں کا سلسلہ بھی نہیں

وہ شخص بند کتابوں سا ظرف رکھتا تھا
اک عمر ساتھ رہا اور کبھی کھُلا بھی نہیں !

جام احساس کا چھلکے تو تجھے خط لِکھوں
شب کا آنچل ذرا ڈھلکے تو تجھے خط لِکھوں

بے قراری مری جانب سے کسی خط کیلئے
تیری تحریر سے جھلکے تو تجھے خط لِکھوں

اے مرے ''آج'' ٹھہر' وقت کڑا ہے مجھ پر
زخم بھر جائیں جو ''کل'' کے تو تجھے خط لِکھوں

فرطِ جذبات سے کانپے مِرا محتاط قلم
چل سکے گر یہ سنبھل کے تو تجھے خط لِکھوں

بھیج دینے ہیں لفافے میں جگر کے ٹکڑے
شعر ہوجائیں غزل کے تو تجھے خط لِکھوں

آگ اور خوں کا گیا سال بھلائیں کیسے
اے نئے سال ترا جشن منائیں کیسے ؟

حادثے' قحط' بموں کے یہ دھماکے' یہ فساد
اس کڑی دھوپ میں ہم پھول کِھلائیں کیسے

زلزلے نغمگی افکار کی لے ڈوبے ہیں
شورِ محشر میں کوئی گیت سُنائیں کیسے

پھر کبھی اے غمِ جاناں' ابھی فرصت کم ہے
اتنی عجلت میں ترے ناز اُٹھائیں کیسے ؟

تُم تو خود ایک گنہ گارِ محبّت ہو ندیم
پھر دیا کرتے ہو اوروں کو سزائیں کیسے ؟

محبت میں اداکاری سے بچئیے
عبادت ہے، ریاکاری سے بچئیے

عداوت ایک حربہ ہے پُرانا
نئے اس عہد میں یاری سے بچئیے

یہ ہے دریائے فکر و فن میاں جی
یہاں احساسِ سرشاری سے بچئیے

نئی قدروں پہ محنت کب غلط ہے
پہ غالب کی طرفداری سے بچئیے

حسد کے شر سے رکھیئے دور خود کو
جلا ڈالے گی، چنگاری سے بچئیے

ہم کو صاحب شوقِ آرائش کہاں
سادگی محتاجِ زیبائش کہاں

نِت نئے غم اپنے دِل پر اب محیط
ہے غمِ جاناں کی گنجائش کہاں ؟

حُسن ہے محدود ماہ و سال میں
عشق کی ہوتی ہے پیمائش کہاں

وہ ستم گر خود کرم فرمائے ہے
ہم کیا کرتے ہیں فرمائش کہاں

روگ دل کا شیخ کیا جانیں ندیم
اُن کو حاصل ہے یہ آسائش کہاں؟

ترکِ تعلّق کا یہ عالم، مَیں بھی سوچوں تُو بھی سوچ
شعلہ شعلہ، شبنم شبنم، مَیں بھی سوچوں تُو بھی سوچ

کیوں اب کے جاڑوں کی راتیں اتنی لمبی لگتی ہیں
کیوں آنکھوں میں نیندیں کم کم، مَیں بھی سوچوں تُو بھی سوچ

کیونکر اب تک خوشبو بانٹے دونوں کی تنہائی کو
یادوں کا بوسیدہ البم، مَیں بھی سوچوں تُو بھی سوچ

چین سے جینا ہاتھ آجائے، اس کوشش میں عمر کٹی
نظمِ دل وجاں اب تک برہم، مَیں بھی سوچوں تُو بھی سوچ

اپنے ہاتھوں ہم دونوں نے دفن جسے کر ڈالا تھا
کیوں اُٹھتا ہے درد وہ پیہم، مَیں بھی سوچوں تُو بھی سوچ

ڈل جھیل کے حسین نظاروں کا سلسلہ
کس کو پکارتا ہے شکاروں کا سلسلہ

ق

تکتی ہیں کس کی راہ یہ برفیلی وادیاں
ہے محوِ انتظار چناروں کا سلسلہ

کب میرے پاؤں پھر سے پڑیں گے زمین پر
کب ختم ہوگا چاند ستاروں کا سلسلہ

اب کے نہ جانے کون سے موسم کی زد میں ہُوں
مجھ کو ترس رہا ہے بہاروں کا سلسلہ

رَگ رَگ سے جیسے پھوٹ رہی ہے حیاتِ نَو
اور میرے آس پاس مزاروں کا سلسلہ

اُتنی ہی مجھ پہ وسعتِ کون و مکاں ہے تنگ
جتنا طویل ہے مرے یاروں کا سلسلہ

اس چشمِ پُر وقار کے حصّے میں اب کہاں
وہ کھڑکیاں، وہ شوخ اشاروں کا سلسلہ

مُسکان صبح و شام لبوں پر، یہ اور بات
ہم پر ہے ختم درد کے ماروں کا سلسلہ

وفا کی راہ میں کوئی چمن مِلے نہ مِلے
غموں کی شب میں خوشی کی کرن مِلے نہ مِلے

یہی تو وقت ہے جلوے سمیٹ لینے کا
جمالِ یار کو پھر بانکپن مِلے نہ مِلے

مَیں اپنی ذات میں اِک انجمن سے کم تو نہیں
مجھے بلا سے کوئی انجمن مِلے نہ مِلے

ہماری قدر بھی کر لے ہمارے بعد تُجھے
خرد کے دَور میں دیوانہ پن مِلے نہ مِلے

تُم آج فیض اُٹھا لو کہ کل ندیمؔ میاں
کسی کے درد کی میٹھی چبھن مِلے نہ مِلے

نہ ہم سے آنکھ چُرائے تو کچھ یقیں آئے
یہ اُن کا غم ہے' لبھائے تو کچھ یقیں آئے

سُنا ہے پھر مرے دامن میں آ گری ہے خوشی
اگر یہ راس نہ آئے تو کچھ یقیں آئے

مَیں لکھ رہا ہُوں انھیں خط یقیں نہیں آتا
قلم نہ ساتھ نبھائے تو کچھ یقیں آئے

سخاوتوں کے سمندر کی' خوب چرچے ہیں
ہماری پیاس بجھائے تو کچھ یقیں آئے

سُنا تو ہے کہ قیامت کی آمد آمد ہے
وہ میرے ناز اُٹھائے تو کچھ یقیں آئے

کس طرح راس مجھے شہرِ تمنّا آتا
مسئلہ ہر گلی کوچے میں انا کا آتا

ٹھوکریں کھا کے ہی آیا ہے سنبھلنے کا شعور
تم پہ مرتے نہ یہ جینے کا سلیقہ آتا

کاش جذبات کی یخ بستہ حویلی کے مکیں
تیرے حصّے میں کوئی دھوپ کا ٹکڑا آتا

پھر ترے شہر کی تسخیر بہت آساں تھی
اک ذرا مجھ کو سیاست کا سمجھنا آتا

تم بھی یاروں کی چُنی راہ پہ چلتے جو ندیم
دشت ملتا نہ کہیں آگ کا دریا آتا

عشق کی ناؤ سلیقے سے چلاؤ لوگو
جھیل گہری ہے، کہیں ڈوب نہ جاؤ لوگو

سیکھ لو شیخ و برہمن سے ہُنر جینے کا
سب کرو وقت کی آنکھوں میں نہ آؤ لوگو

خون کے گھونٹ پیے جاؤ یہاں شام وسحر
پیاس اپنی کسی صورت تو بجھاؤ لوگو

اجنبی لمس ہو خوشبو ہو نرالی جس کی
فکر کی شاخ پہ وہ پھول کِھلاؤ لوگو

زندگی کی فقط اتنی ہی علامت تو نہیں
صرف سانسوں کے تسلسل پہ نہ جاؤ لوگو

نقش یادوں کا تری ہم نے مِٹانے نہ دیا
گھر کسی اور کو اس دل میں بنانے نہ دیا

یا تو اُس نے کبھی بانہوں کا کیا ہار مجھے
یا کبھی پھول بھی زلفوں میں سجانے نہ دیا

وہ مجھے باندھ کے رکھنے میں بڑا ماہر تھا
مجھ تک آیا بھی، مجھے پاس بھی آنے نہ دیا

اُس کی خواہش تھی کہ تجدیدِ مراسم کر لیں
مَیں بھی مائل تھا مگر ساتھ انَا نے نہ دیا

رات اِک چاند اُگا تھا مرے کمرے میں ندیم
صبح تک جس نے مجھے دیپ جلانے نہ دیا

○

نغمہ ہائے گل و بلبل مَیں سناؤں کب تک
ان روایاتِ قدیمہ سے پریشان ہُوں مَیں

آؤ کچھ اور سُنو مجھ سے زمانے والو
شعر و نغمے کا بدلتا ہُوا رُجحان ہُوں مَیں

○

(۱۹۹۱ء کی خشک سالی سے متاثر ہو کر)

ربّ کریم سُوئے فلک دیکھتی ہے قوم
بکھرے ہوئے اِن ابر کے ٹکڑوں کو جوڑ دے

کھیتوں میں رزق ڈال‘ دعائیں قبول کر
اُڑتے سمندروں کو زمیں پر نچوڑ دے

○

وہ بے وفائی کر کے بھی تیکھا بڑا لگے
دیکھوں اُسے تو دشتِ تمنّا ہَرا لگے

کاجل جو رُخ پہ پھیل گیا ہے یہاں وہاں
جھیلا ہے آپ نے بھی کوئی رَت جگا لگے

تُم اُس کی دسترس میں ہو اتنا رہے خیال
ہر نا رَوا سلوک جب اُس کا رَوا لگے

دہشت زدہ ہیں شہر‘ تحفّظ کسے نصیب
اسکول جائیں بچّے تو اب خوف سا لگے

کب اُس کو دی بدلتے ہوئے موسموں نے مات
جب جب دکھائی دے مجھے تب تب نیا لگے

ہم ایسے رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں ندیم
اِک عمر کا ہو ساتھ مگر فاصلا لگے !!

احساسِ محبّت کو زنجیر کی حاجت کیا
مٹّی کے کھلونے ہیں رشتوں کی حقیقت کیا

اس شہر میں ٹھہری ہے اک عیب خرد مندی
راس آئے ہمیں صاحب یہ شہرِ سیاست کیا

جھکتی ہوئی پلکوں کا اعجاز ہے یہ' ورنہ
طے ہوتی ہے لمحوں میں برسوں کی مسافت کیا؟

محنت کی کمائی کے پالے جو نہ ہم ہوتے
اس درجہ لبھاتی تھی' غلّے کی تجارت کیا؟

غم عشق کا آنکھوں میں روکے نہ اگر کوئی
وہ اپنے اثاثے کی کر پائے حفاظت کیا؟

شوق سے آسماں میں اُڑا کیجئے
دُکھ زمیں کے بھی لیکن سہا کیجئے

حوصلہ اپنی لَو کو عطا کیجئے
تیز تر آندھیوں میں جلا کیجئے

نیم وَا اور کب تک دریچہ حضور؟
ہم سے کھُل کر کبھی تو مِلا کیجئے

کیجئے نذرِ آتش کسی کے خطوط
بارہا زخمِ دل کیوں ہَرا کیجئے

خامشی ٹالتی ہے بَلائیں ہزار
سُن لیا کیجئے' چُپ رَہا کیجئے

''عشق جی'' اِن دِنوں مہرباں ہم پہ ہیں
کچھ دَوا کیجئے' کچھ دُعا کیجئے

معتبر کس کی نگاہوں میں ہُوا ہُوں مَیں بھی ؟
کیا کسی شوخ کا پیمانِ وفا ہُوں مَیں بھی ؟

اُس کی تکمیل نہ ہو پائی بچھڑ کر مجھ سے
اپنے اندر ہی کہیں ٹوٹ گیا ہُوں مَیں بھی

گیت کے دل میں، کسی نظم کی گہرائی میں
کیا کہیں آپ کو محسوس ہُوا ہُوں مَیں بھی ؟

اُس کو تلقین تو کر آیا بندھے رہنے کی
اپنے ہاتھوں سے مگر چھوٹ گیا ہُوں مَیں بھی

مَیں نہ سُقراط، نہ ہُوں وقت کا منصُور، ندیم
ہاں پہ اِس دَور میں سچ بول رہا ہُوں مَیں بھی

کسی مہوش کا پیار ہے دُنیا
"چار دن کی بہار ہے دُنیا"

قرض مجھ سے وصولتی یُوں ہے
جیسے اِک ساہوکار ہے دُنیا

کیا مری وحشتوں کی قدر کرے
کب سلیقہ شعار ہے دُنیا ؟

تُم اگر ساتھ ہو تو بادِ نسیم
ورنہ گردِ و غبار ہے دُنیا

بے نیازی کا فیض ہے شاید
میری بانہوں کا ہار ہے دُنیا

وہ کہ جس کا فن لگے ہے عرش کو چھوتا ہُوا
مفلسی کی دھوپ میں مدّت سے ہے جُھلسا ہُوا

عمر بھر آدابِ میخانہ نبھانے کا صلہ
ہاتھ آیا ہے ہمارے جام اِک ٹوٹا ہُوا

ہائے وہ اک شخص جو پڑھتا تھا چہروں کی کتاب
جُرم کی اپنے سزا پا ہی گیا ' اندھا ہُوا

جب کوئی پردیس جاتا ہے تلاشِ رِزق میں
یاد آجاتا ہے مجھ کو بھائی اک بچھڑا ہُوا

زندگی کو ہم نے گایا ٹوٹ کر کچھ یُوں ندیمؔ
ہوگیا پُر کیف ' نغمہ درد میں ڈوبا ہُوا

(صحنِ کعبہ میں دورانِ حجِّ بیت اللہ)

وہ زندہ ہے یارب کہ مرحوم جانوں ؟
دعا کرتے کرتے سوال آگیا ہے

یہ کیوں صحنِ کعبہ میں آنکھیں ہیں نم
اچانک یہ کِس کا خیال آگیا ہے ؟

(''ظفر'' کو یاد کرکے)

اُردو

حُکّام تیری زُلف کے برسوں سے ہیں اسیر
''اُردو'' پہ طے ہُوا ہے سفر تیرا کیوں نہیں؟

خوشبو سے تیری لوک سبھا تک ہے فیض یاب
سرکاری دفتروں میں گزر تیرا کیوں نہیں؟

پھر ترا غم مجھے بے چین نہ کر جائے کہیں
شب کے سینے میں یہ نشتر نہ اُتر جائے کہیں

خود ستائی کو کبھی منہ نہ لگا یار مِرے
زہر بن کر ترے اندر نہ بکھر جائے کہیں

ہنس کے جو دار و رسن سے بھی گزر جاتا ہے
کُوئے جاناں میں نہ وہ شخص ٹھہر جائے کہیں

قدر کرتا ہُوں ہنر کی ترے، دل سے لیکن
چارہ گر دیکھ مرا زخم نہ بھر جائے کہیں

ہاں، جدائی بھی ضروری ہے محبّت میں ندیمؔ
ورنہ احساسِ محبّت ہی نہ مر جائے کہیں

صدیوں کا اندر سے ہمیں تو پیاسا لگتا ہے
دُنیا کو منظورؔ بظاہر دریا لگتا ہے

اتنا عرصہ بیت چکا تھا ہم دونوں کو بچھڑے
کل شب اُن کا مجھ سے مِلنا سپنا لگتا ہے

جن ہاتھوں کے پتھّر لاکھوں شیشے توڑ چکے
کب آئینہ اُن ہاتھوں میں اچھّا لگتا ہے؟

کیسی پیاری رنگت اُس کی، کتنا تیکھا روپ
جسموں کی اس بھیڑ میں بھی وہ تنہا لگتا ہے

کس کو دل کا حال سُنائیں، اپنے زخم دِکھائیں؟
سارا شہر تو جیسے اندھا بہرا لگتا ہے

ہم سے ہماری ذات کے غم بدگماں رہے
ہم اس قدر اسیرِ غمِ دوستاں رہے

اتنا بھی اجتناب کہ جینا محال ہو !
لگ جا گلے کہ خون رگوں میں رواں رہے

تاریکیوں سے ہم کو بھی نفرت رہی مگر
سورج وہاں پہنچ نہ سکا ' ہم جہاں رہے

اے کاش ڈھل سکے نہ کبھی حادثوں کی دھوپ
زندہ ہُوں ' جی رہا ہُوں مجھے یہ گماں رہے

ہم کو دل و دماغ پہ قابو ہے اے ندیمؔ
سو سال کوئی چاہے تو نا مہرباں رہے

ٹوٹا جو دل تو جینے کا اِک آسرا مِلا !
چاہت میں اُن کی ' درد بڑا کام کا مِلا

ہر ہر قدم پہ طنز ہُوا میری ذات پر
انصاف بانٹنے کا مجھے یہ صِلہ مِلا

پتھراؤ جس گلی میں ہے معمول صبح و شام
ایسی گلی میں ہم کو مکاں کانچ کا مِلا

ہم دشتِ فکر و فن میں جو بھٹکے تمام عمر
جُز اضطرابِ شام و سحر اور کیا مِلا ؟

اپنی نظر ہی اُٹھ نہ سکی ورنہ اے ندیمؔ
کب کب نہ وہ دریچہ ہمیں اَدھ کھُلا مِلا

حیات جب بھی مسائل سے منہ چھپاتی ہے
کسی کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوب جاتی ہے

وہ پڑھ کے خط مِرا پھینکے بھی گر دِکھاوے کو
تو اُس کے چہرے پہ تحریر مسکراتی ہے

تجھے سلیقے سے دیکھیں یہ کس طرح ممکن
بہارِ حسن نگاہوں میں کب سماتی ہے ؟

کھنکنے لگتے ہیں برتن کچن میں رات گئے
یہ کس کی یاد دبے پاؤں گھر میں آتی ہے؟

پُرانی قدریں لچکدار ہو چلی ہیں ندیمؔ
اَنا بھی اب ہمیں رستے نئے سجھاتی ہے

عمر کٹ جائے ' یہ راہی نہیں تھکنے والا
ہے عجب ' دشتِ محبّت میں بھٹکنے والا

کاش کچھ روز خوشی اور نہ ملتی مجھ کو
میرا غم تھا تری آنکھوں سے چھلکنے والا

جو سنبھل جائے ' اُسے نام دیں اہلِ ایماں
ہاں ' یہ کم ظرف بہت ' پی کے بہکنے والا

کیا ملے گا تجھے اب رات گئے گھر جا کر
سو گیا ہوگا تری راہ کا تکنے والا

سخت جاں ہم ہی رہے اُس کے تعلّق سے ندیمؔ
وہ تو تھا شاخ کی مانند لچکنے والا

ادھورا سا لگے گا پھر یہ گھر، جب ہم نہیں ہونگے
تکیں گے راستہ دیوار و دَر، جب ہم نہیں ہونگے

پریشانی نہ دیکھی جائے گی برقِ حوادث کی
گرے گی پھر یہ کس پر ٹوٹ کر، جب ہم نہیں ہونگے؟

حدیثِ عشق کا مفہوم پھر سمجھا سکے گا کون
کِسے مانے گی دُنیا معتبر، جب ہم نہیں ہونگے

کسے فرصت کہ ڈیرا ڈال کر بیٹھا کرے پہروں
ہمیں ڈھونڈے گی تیری رہگزر جب ہم نہیں ہونگے

ندیمؔ اس کی ترقّی میں ہمارا بھی ہے کچھ حصّہ
حقیقت یہ کھُلے گی گاؤں پر، جب ہم نہیں ہونگے

اس کی یادوں کا کھُلا البم رہا
رات بھر برسات کا موسم رہا

ہم شبِ فرقت میں بھی خوش حال تھے
صبح تک پلکوں پہ وہ ہمدم رہا

معذرت لکھّی تھی اُس نے ٹوٹ کر
"ایک مدّت تک وہ کاغذ نم رہا"

وقتِ رُخصت مُڑ کے اُس کا دیکھنا
عمر بھر نظروں میں وہ عالم رہا

اِک یہی احساس فرحت بخش ہے
مدّتوں اُن کو ہمارا غم رہا

کس جگہ مندر بنے' مسجد کہاں
تھا سیاسی مسئلہ' پیہم رہا

آگ بھی اُس نے لگائی شہر میں
امن کا جس ہاتھ میں پرچم رہا

دِل پہ بھی پژمُردگی سی تھی ندیمؔ
درد جو پچھلے دِنوں کچھ کم رہا

اک بار زندگی میں کچھ ایسا بھی کاش ہو
ہم مِل نہ پائیں اُن کو ہماری تلاش ہو

نغمے مسرّتوں کے ہے چھیڑے ہوئے زباں
تاروں میں دِل کے دیکھیئے کب ارتعاش ہو

معشوق جُزّ کے شیخ سے' شہرت کا خواستگار
اور شیخ کو یہ فکر کہ پردہ نہ فاش ہو

سُلجھائے کیسے وہ تری زُلفوں کے پیچ وخم
دُنیا بھی' جس کا دین بھی فکرِ معاش ہو

کچھ اِن دِنوں سوا ہے ندیمؔ اُن کا التفات
شیشہ نہ تیرے دل کا کہیں پاش پاش ہو

○

وہ تشنہ لب ہُوں کہ دریا مری تلاش میں ہے
مئی میں ابر کا ٹکڑا مری تلاش میں ہے

کسی کی یاد ہے اِن بوڑھے جنگلوں میں نہاں
لگے ہے یوں کوئی نغمہ مری تلاش میں ہے

کہیں وہ درد کی دولت نہ چھین لے مجھ سے
خبر یہ ہے کہ مسیحا مری تلاش میں ہے

دراز مُجھ پہ تدابیر کی گھنی زُلفیں
مرے نصیب کا لکھا مری تلاش میں ہے

مِلا ہُوں سب سے مگر خود سے مِل نہیں پایا
مرا وجود اکیلا مری تلاش میں ہے

○

اے غمِ جاناں کی گہرائی کیسے آواز دُوں
لب ہلانے میں ہے رُسوائی کیسے آواز دُوں

سسکیاں اِس شور وغُل میں کیا کوئی سُن پائے گا
ہر طرف بجتی ہے شہنائی کیسے آواز دُوں

تُو کہ اے بینائی، اس اندھے نگر کی شۓ نہیں
کون ہے یاں تیرا سودائی، کیسے آواز دُوں

محفلیں اُن سے بچھڑ کر جان لیوا ہوگئیں
ڈس رہا ہے دشتِ تنہائی کیسے آواز دُوں

اِن دِنوں نازک بہت ہے میرے زخموں کا مزاج
عام ہے گھر گھر مسیحائی، کیسے آواز دُوں

عہدِ نو کی یہ کتابیں ' یہ جریدے پڑھیئے
وقت کا آج تقاضا ہے کہ چہرے پڑھیئے

اُف مری قوم کی بربادی کا یہ افسانہ
اِس میں تحریر ہیں کچھ اندھے عقیدے ' پڑھیئے

دِل کے زخموں کو دِکھانے میں بہت ہم محتاط
آپ یُوں کیجیے ' اشعار ہمارے پڑھیئے

تھے وہ دن ' داد بزرگانِ سُخن دیتے تھے
اپنی ہی شان میں اب اپنے قصیدے پڑھیئے

ڈھونڈیئے مت ہمیں ایوانِ سیاست میں کہیں
ہم سے مِلنا ہو تو پھر ادبی رسالے پڑھیئے

مرے قریب سے کچھ یوں گزر گیا ہے کوئی
کہ مجھ کو مجھ سے بہت دور کر گیا ہے کوئی

اب اُس سے ترکِ تعلّق کہاں رہا ممکن ؟
کہ ٹوٹ کر مرے اندر بکھر گیا ہے کوئی

ٹپک پڑیں' تو مَیں کنگال ہو کے رہ جاؤں
وہ اشک' جو مری آنکھوں میں بھر گیا ہے کوئی

چلا گیا تھا مرے در سے بے نیازانہ
گلی کے موڑ پہ جا کر ٹھہر گیا ہے کوئی

''ندیم کون ہے' ہم جانتے نہیں'' بولے
مِری تلاش میں جب اُن کے گھر گیا ہے کوئی

دھوپ سے گردشِ دوراں کی جو گھبراؤں گا
مَیں تری جھیل سی آنکھوں میں اُتر جاؤں گا

راحتِ قُرب کہ احساسِ جُدائی ہو جناب
عشق ہُوں آپ کی سانسوں کو مَیں گرماؤں گا

بے گناہی مری کُچھ تُو ہی بتا مَیں کب تک؟
اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا پاؤں گا

خط نہ لکھ پاؤں تو بھیجوں گا انھیں شعر نئے
مسئلہ ایسے تخاطب کا مَیں سُلجھاؤں گا

چھوڑ کر تجھ کو کہیں دُور چَلا جاؤں، جو مَیں
اے مرے شہر تجھے یاد بہت آؤں گا

بے لوث ہیں تم جیسی سیاست نہیں کرتے
ہم قوم کے کاموں میں تجارت نہیں کرتے

چُپ سادھ کے سُنتے ہیں خلاف اپنے دلیلیں
مُنصف ہیں سو ہم اپنی وکالت نہیں کرتے

کم ظرف سے اُلجھیں یہ نہیں ظرف ہمارا
ہم ہر کس و ناکس سے عداوت نہیں کرتے

قدموں تلے رکھتے ہیں زمانہ یہ الگ بات
ہم اپنے بزرگوں سے بغاوت نہیں کرتے

پتھّر کی تراشے سے سنوارا کریں تقدیر
"ہم اپنے مقدّر سے شکایت نہیں کرتے"

مرا مزاج اگر بوریا نشینی ہے
تو طنز ہونا مری ذات پر یقینی ہے

فلک پہ بھرتے ہیں بھائی مرے اُڑان تو کیا
جو مسئلہ مجھے درپیش ہے زمینی ہے

ہے کس کی یاد کے آنچل میں سرسراہٹ سی
کہاں سے آئی یہ خوشبو جو بھینی بھینی ہے

ادب سے یہ بھی ہمارے حضور پیش ہوئی
ہماری نیند کہاں عاشقی نے چھینی ہے

کسی کو فکر کہ کشتی نہ قوم کی ڈوبے
کسی کا ذوقِ نظر بس تماش بینی ہے

غزل نہ ڈھونڈ میاں آج میرؔ و غالبؔ کی
ہم ایسے دَور میں جیتے ہیں جو مشینی ہے

کچھ اہلِ سیاست ہیں، کچھ بیٹھے ہیں دھن والے
یہ بزمِ سخن کیسی، کم کم ہیں سخن والے !

غم ہم پہ ہو یوں مائل ایامِ مسرّت میں
پردیس میں ہاتھ آئیں جس طرح وطن والے

کیا شیخ و برہمن سے یارانہ رہے اپنا
وہ مسجد و مندر تک، ہم گنگ و جمن والے

مضمون بھی پیارا ہو خوش رنگ لفافے کا
کچھ دِل پہ بھی محنت کر، اے اُجلے بدن والے

جو ہاں میں ملا دیں ہاں، وہ شاہ کے پہلو میں
دربار سے باہر ہیں ماتھے پہ شکن والے

پھولوں سی کبھی اپنے افکار میں نرمی تھی
اب شعر نکلتے ہیں نشتر سی چبھن والے

''یارب حصارِ ذات کے شر سے رہائی دے''
شاہی میں بھی مجھے نہ کبھی خود ستائی دے

تُو جائے ہاتھ سے تو مَیں کنگال ہو رَہوں
پرکھوں کی جائیداد میں حصّہ نہ بھائی دے

مُنصف ہوئے ہیں ہم بھی سمندر کھنگال کر
ہم کو نہ عقل کوئی وکیلِ صفائی دے

مَولا مَیں سو رہوں پھٹی چادر پہ شوق سے
آنگن دے بالاپور کا ' اک چارپائی دے

اُکتا گئی ہے زُلف ولب و رُخ سے اب غزل
اِن بندشوں سے میرے قلم کو رہائی دے

چھالے ہیں تیرے دستِ مشقّت میں اے ندیم
کیا اس میں کوئی پھول سی نازک کلائی دے؟

مسئلہ تھا عالمی ' کیا اس طرح حل ہوگیا ؟
جیل میں پُونا کی مانا دفن ''اجمل'' ہوگیا

اور کب تک ضبط کر سکتی تھی چشمِ انتظار
خُشک جھرنا شام کے ڈھلتے ہی جَل تھَل ہوگیا

تھی اُسے شہرِ نگاراں میں وفا کی جستجو
ہائے اک اچھّا بھلا انسان پاگل ہوگیا

وہ جو تھے اندر کے دُکھ ' رُخ پر نمایاں ہوگئے
گھر کا بھیدی اُن حسیں آنکھوں کا کاجل ہوگیا

آڑی ترچھی کچھ لکیریں بس گئی تھیں ذہن میں
دیکھتے ہی اُن کو ' اک نقشہ مکمّل ہوگیا

مجبوریوں میں اُس کی اَنا رَام ہوگئی
یہ شئے بھی نذرِ گردشِ ایّام ہوگئی

ناسور بن کے رہ گئی چاہت کے جسم کا
وہ ابتداء جو واقفِ انجام ہوگئی

یہ کیا کہ آ کے غیروں نے سکّہ جما لیا
تیری گلی بھی وادیٔ آسام ہوگئی

کوشش تو میری جیت بھی لیتی اُسے مگر
اک سوچ درمیاں تھی، جو ناکام ہوگئی

شاید کہ رہگذر کوئی تبدیل کر گیا
اب گھر چلو ندیمؔ میاں، شام ہوگئی

کچھ اپنے درد کے جلوے بھی تو دِکھاؤں اُسے
"وہ میری راہ تکے، مَیں نظر نہ آؤں اُسے"

امیرِ شہر حسد کی لپیٹ میں خود ہے
یہ میرا ظرف نہیں ہے کہ مَیں جلاؤں اُسے

خرد کے دَور میں اتنی سہولتیں کب ہیں
نہ اب وہ روٹھ کے بیٹھے نہ مَیں مناؤں اُسے

سکونِ قلب کی مدّت سے جستجو ہے مجھے
کسی دُکاں پہ مِلے تو خرید لاؤں اُسے

جواب پاؤں سے باندھا تو ہے کبوتر کے
ہو پھر سے وَا وہ دریچہ، تو مَیں اُڑاؤں اُسے

بکھر چکا ہے جو اِک شخص ٹوٹ کر مجھ میں
مجھے یہ حکم ہُوا ہے کہ بھول جاؤں اُسے

عطا ہوئی ہے جو مجھ کو متاعِ فکرِ سخن
اب ایک بوجھ لگے ہے کہاں کھپاؤں اُسے؟

اَٹل ہے خانہ بدوشی ملازمت میں ندیمؔ
نصیب میں جو لکھا ہے، مَیں کیا مِٹاؤں اُسے

اُن سے جب تک جُڑا نہیں ہوتا
درد راحت فزا نہیں ہوتا

زاویے پر نظر کے ہے موقوف
کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا

عشق احساس ہے ثبوت نہ مانگ
کاغذوں پر لکھا نہیں ہوتا

مر گئے چشم دید تھے جو گواہ
کیس کا فیصلہ نہیں ہوتا

خونِ دل نذر جب تلک نہ کریں
حق غزل کا ادا نہیں ہوتا

اِن[1] دِنوں خط بشیر بدرؔ کہاں ؟
آنکھوں آنکھوں میں کیا نہیں ہوتا ؟

ہم نہ گزریں جو اس گلی سے ندیمؔ
وہ دریچہ بھی وَا نہیں ہوتا

[1] ڈاکٹر بشیر بدرؔ کے درج ذیل شعر سے مستعار
پڑھائی لکھائی کا موسم کہاں ؟
کتابوں میں خط آنے جانے لگے

رنگوں سے کینوس پہ وہ پیکر سمیٹ لُوں
کوزے میں آج مَیں بھی سمندر سمیٹ لُوں

دفتر سے کچھ دِنوں کی ہے رُخصت مِلی ہوئی
یادوں کا اُس کی ٹوٹتا لشکر سمیٹ لُوں

بس اک اَنا سے آنکھ چُرانے کی دیر ہے
دامن میں چاہوں جب مہہ و اختر سمیٹ لُوں

آجاؤ تُم کہ گرم ہَوائیں خُنک لگیں
اپریل کے دِنوں میں دسمبر سمیٹ لُوں

چُن لُوں عطا کئے ہیں جو یاروں نے مُجھ کو پھول
آنگن میں جو پڑے ہیں وہ پتھّر سمیٹ لُوں

بینائی عمر بھر نہ ہو کم مَیں جو آنکھ میں
اُن سے بچھڑتے وقت کا منظر سمیٹ لُوں

روئے گی، مجھ کو ڈھونڈا کرے گی یہاں وہاں
یہ تیری انجمن، جو مَیں بستر سمیٹ لُوں

جاتا رہے گا لُطف اُڑانوں کا اے ندیمؔ
ہو کر وظیفہ یاب جو مَیں پَر سمیٹ لُوں

نامناسب یہاں "احساس نگر" میں رہنا
شہر پتھّر کا ہے، کیوں کانچ کے گھر میں رہنا

عمر بھر پھر کوئی منزل نہ ہمیں راس آئی
ہائے کچھ دِن وہ ترے ساتھ سفر میں رہنا

ہم یہاں بھی ترے باعث ہی رہے ہیں ' ورنہ
کب گوارا تھا ہمیں شاہ خبر میں رہنا

نت نئے غم اِسے للچاتے ہیں اب شام وسحر
دل نے کب تک غمِ جاناں کے اثر میں رہنا

ہم میں کچھ وصف ' کوئی بات تو ہوگی مخصوص
ورنہ برسوں کسی مہوش کی نظر میں رہنا !

غم ہرا تجھ کو رُلائے گا کہ آتا ہے اِسے
موم بن کر کسی پتھّر کے جگر میں رہنا

بڑھ کے تاریکیٔ شب ہی سے مِلاتے ہیں نظر
ہم نے سیکھا نہیں اُمیدِ سحر میں رہنا

گھر کئی اور بھی ہیں شہرِ محبّت میں ندیمؔ
کب ہے لازم لب ورُخسار کے گھر میں رہنا

لاکھ انکار کیا کیجئے ' کیا ہوتا ہے ؟
غم محبّت کا تو چہرے پہ سجا ہوتا ہے

موسمِ ترکِ تعلّق بھی ہے کتنا شاداب
اُن کو دیکھے سے ہر اک زخم ہرا ہوتا ہے

میری وحشت کی سُناتے ہیں کہانی وہ ہنوز
جِن درختوں پہ ترا نام کھُدا ہوتا ہے

کردو ''ایوان'' میں ''انا[1]'' کی حمایت ''سائیں''
ایسے حربوں سے سیاست میں بھَلا ہوتا ہے

اُسکی تحریر بھی کہتی تو ہے کچھ کچھ لیکن
اُف وہ مفہوم جو آنکھوں سے ادا ہوتا ہے

رات بھر زیرِ قلم جو رہے کاغذ' اُس پر
صبح دیکھوں تو بس اِک نام لکھا ہوتا ہے !

ایک ہی شکل کی مورت نکل آتی ہے ندیمؔ
پتھّروں کو مَیں تراشوں تو یہ کیا ہوتا ہے !!

[1] انّا ہزارے کے سُجھائے ہوئے لوک پال بِل پر پارلیمنٹ میں غور و خوص

اُن سے بچھڑ کر پیار تو اب نئیں ہونے کا
دل پھر سے گلزار تو اب نئیں ہونے کا

پتھّر کے اس شہر میں ہم سے صاحب جی
شیشوں کا بیوپار تو اب نئیں ہونے کا

عمر ڈھلے بھی خوشبو کا انبار ہے وہ
پھول مگر تلوار تو اب نئیں ہونے کا

ڈر ہی ڈر میں عمر گنوادی چھوڑو شیخ
تم سے یہ دریا پار تو اب نئیں ہونے کا

اہلِ جنوں اِس دَورِ خرد میں ہیں نایاب
جشنِ صلیب و دَار تو اب نئیں ہونے کا

یاں سے خموشی ہی سر چڑھ کر بولے گی
وَا یہ لبِ اظہار تو اب نئیں ہونے کا

اتنا لت پت خون میں چاروں جانب سے
ممبئی[۱] کا اخبار تو اب نئیں ہونے کا

۱؎ ۲۶ رنومبر ۲۰۰۸ء کی دہشت گردی کے بعد

(ہند پاک حالیہ تعلّقات کے تناظر میں)

شبِ ہجراں سحر آثار بھی ہے
اندھیروں کی بہت یلغار بھی ہے

بجا، ہمسائیگی میں پیار بھی ہے
پسِ پردہ مگر انکار بھی ہے

کہاں آسان تجدیدِ مراسم ؟
کھڑی آنگن میں اِک دیوار بھی ہے

کبوتر امن کے محوِ تکلّم
فضا سرحد کی شعلہ بار بھی ہے

ہوئے ہیں عہد و پیماں، بات کل کی
نظر میں آج کا اخبار بھی ہے

بظاہر جلد بازی میں ہیں قائد
مگر دھیمی بہت رفتار بھی ہے

کوئی کیوں مسئلے کا حل نکالے ؟
اسی سے گرمیٔ بازار بھی ہے

سیاست دونوں جانب کی یہ سُن لے
جو دُکھ اِس پار ہے، اُس پار بھی ہے

منفرد رنگ مِلے، فکر میں جدّت نکلے
مَیں اگر شعر کہوں اتنی تو اُجرت نکلے

کھڑکیاں کھول دو، اُڑ جانے دو خواہش کے پرند
وہ جو سر میں ہے سمائی ہوئی وحشت نکلے

سوچتا کیوں ہے بچھڑ جانے کی نسبت سے میاں
اس سے پہلے کہ کوئی مِلنے کی صورت نکلے

اُس کی آنکھوں سے چھلک جاؤں میں آنسو بن کر
زندگی میں کبھی اتنی تو سہولت نکلے

کیا کریں ہم ترے اشعار پہ تنقید ندیمؔ
کب کوئی نکتۂ توہینِ عدالت نکلے

رشوت سے ہو کے بر سرِ پیکار گر گئی
حق گو بہت تھی، ''آپ'' کی سرکار گر گئی

میدانِ جنگ میں یہ عجب سانحہ ہُوا
دو دھاری ہوگئی تھی جو تلوار گر گئی

ٹوپی جو چند ماہ سے سر پر سوار تھی
ایسی ہَوا چلی کہ مرے یار گر گئی

موجوں کے اب تھپیڑے ہی کشتی کریں گے پار
مانجھی کی جلد بازی میں پتوار گر گئی

عیّار لوگ اس کو اُٹھانے میں تھے شریک
آخر یہی تو ہونا تھا، دیوار گر گئی

کیسی خلیل خاں نے اُڑائی تھی فاختہ
کس سمت اِس کو جانا تھا، کِس پار گر گئی

(دہلی میں ''عام آدمی پارٹی'' کی ۴۹ روزہ سرکار گر جانے کے بعد)

وقت لگتا ہے ناز اُٹھانے میں
کس کو فرصت ہے اس زمانے میں

لد گئے دن کہ لُطف آتا تھا
زُلفِ برہم سنوار پانے میں

اب گھڑی پر نگاہ رہتی ہے
روٹھے محبوب کو منانے میں

نسلِ نَو کو کہاں ہے دلچسپی
''اُن'' کی آنکھوں میں ڈوب جانے میں

چاہتیں، شوق و عیش تک محدود
کون مخلص ہے دل لگانے میں

اب ہیں بچّے، جوان سب ماہر
درد کی دھجیاں اُڑانے میں

لذّتیں اُٹھ گئیں جو ہوتی تھیں
چوٹ سہنے میں، زخم کھانے میں

اب کہیں سے دُھواں نہیں اُٹھتا
میر جی، جان و دل جلانے میں

پیار، وہ جو وبالِ جاں تھا کبھی
ڈھونڈیئے اب کسی فسانے میں

ہیں پشیماں جھُکی جھُکی نظریں
ہو کے ناکام گُل کھِلانے میں

درد، غم، اشک، آہ، سوز، گداز
کیا بچا عشق کے خزانے میں ؟

ہر طرف گرمئ ہوس ہے ندیم
اب محبّت ہے سرد خانے میں

تخت و تاج اُن کے طلبگار ہُوا کرتے ہیں
کچھ فقیر ایسے بھی خوددار ہُوا کرتے ہیں

بے نیازی بھی محبّت کے سفر میں ہو شریک
اِس سے کچھ راستے ہموار ہُوا کرتے ہیں

اب بھی ہو جاؤں مَیں شاداب اُنھیں خط لکھ کر
وہ بھی پڑھ لیں تو طرح دار ہُوا کرتے ہیں

حضرتِ عشق سکھائیں جنھیں آدابِ حیات
وہ بڑے صاحبِ کردار ہُوا کرتے ہیں

چور، اُچکّے، نہ سپاہی نہ عدالت نہ وکیل
اب سبھی دن ہمیں اتوار ہُوا کرتے ہیں

ہم نے دُنیا سے یہ سُن رکھّا ہے منظور ندیم
منفرد آپ کے اشعار ہُوا کرتے ہیں

Dhoop Ka Darakht

(Urdu Poetry)

By.

Manzoor Nadeem



ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے

(منظور ندیم)

Sajid Digital,Akola(9923453010)

"........منظور ندیم کی سچ بولتی ہوئی غزلیں جب عصرِ حاضر کی تیز رفتار زندگی اور اس کے کھُردرے مسائل کو آئینہ دِکھلاتی ہیں تو اُن کی فنّی جمالیات اور بھی زیادہ روشن اور تابناک ہوجاتی ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی کیلئے صرف روایتی رموز وعلائم کا سہارا نہیں لیا ہے بلکہ کچھ ایسی نئی علامتیں بھی وضع کی ہیں جو گرد وپیش میں بکھری ہوئی ناہمواریوں کی پروردہ ہیں۔ مگر یہ علامتیں غزل کی بنیادی موجِ تہہ نشیں کو مجروح نہیں کرتیں بلکہ اُس سے ہم آغوش ہوکر نئی فضاؤں کا اشاریہ بن جاتی ہیں۔

منظور ندیم غمِ جاناں کو غمِ دیگراں' آپ بیتی کو جگ بیتی اور ایک دَور کی حقیقت کو ہر دَور کی حقیقت میں تبدیل کرنے کا ہُنر جانتے ہیں، ان کا سارا کلام اُس توازن اور اعتدال کا ترجمان ہے جو انسانی زندگی میں ڈھل کر مہذّب پیکر اور شاعری میں ڈھل کر تخلیقی فن پارے تراشتا ہے۔ وہ عدل وانصاف کے ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ جس طرح متضاد بیانات کے درمیان اُن کی منصبی ذمّہ داری سچ کو تلاش کرلیتی ہے اُسی طرح اُن کی ادبی ذمّہ داری انسانی زندگی کی محرومیوں اور کامرانیوں میں اُن قدروں کو تلاش کرلیتی ہے۔ جو ماہ وسال کی گردش اور صبح وشام کے چکّر کے باوجود ہر دَور میں شگفتہ وشاداب رہتی ہیں......"

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد
(سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی)
سیمانت نگر، کنچن بہاری مارگ، لکھنؤ ۲۲۶۰۲۳ (یو۔پی)